

عکس

امجد اسلام امجد

PDFBOOKSFREE.PK

عکس

جدید عربی نظموں کا منظوم ترجمہ

امجد اسلام امجد

سنگ میل پبلی کیشنز ۛ لاہور

۱۹۹۱ء

پبلشرز - نیا زا احمد

سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تعداد: ایک ہزار

قیمت ۶۰/۰۰ روپے

تحریک آزادی فلسطین

— کے نام —

جوان نظموں کا سرچشمہ ہے

PALESTINE LIBERATION ORGANIZATION
PAKISTAN OFFICE

NO. 58, STREET No. 27
SHALIMAR G-2, P. O. BOX No. 1061
ISLAMABAD



PHONE 24013

منظمة التحرير الفلسطينية

مكتب باكستان
اسلام آباد

ان مكتب منظمة التحرير الفلسطينية في باكستان يجعل الخطوة الرابعة التي اتاح
بها الشاعر الباكستاني امجد اسلام امجد للشعب الباكستاني بقراءة الشعر العربي الفلسطيني
المعاصر من خلال ترجمته بحبه و من الشعر الفلسطيني الى الاردو
ان الشعب الفلسطيني ونورته المسلحة ظليعه مقدمه وفي الخندق الاول في العالم
للدفاع عن قضايا الحرية والعدالة والادب الفلسطيني شعرا ام نثرا هو ميمرا يحقق من
اصاله و عداله هذا الفاعل *

وجاءت خطوة الشاعر الباكستاني السيد امجد لتقل الى الشعب الفلا الباكستاني الشقيق شعله
النضال الفلسطيني العادل من خلال الشعر الفلسطيني ميمرا عن الاهداف المشتركة
التي تربط الشعبين الباكستاني والفلسطيني

انني باسم منظمة التحرير الفلسطينية وبالنيابة الكتاب الفلسطينية اشكر واقدر
الشاعر الباكستاني السيد امجد اسلام امجد على هذا العمل والجاز الكبير والذي يمثل
الحسن الصادق الذي يربط الشعب الباكستاني والشعب الفلسطيني *

انا نتطلع الى علاقات ثرية بين الكتاب الفلسطيني والباكستاني لخدمه قضا
الانسانيه وقضايا الشعوب التي تناضل من اجل حريتها وكرامتها *

انني على ثقته بان هذا الكتاب سوف يعكس القارئ الباكستاني من الاضطلاع على الفاعل
الجزيل الشاق الذي يخوضه اخوانهم الفلسطينيون من اجل اعاده العداة القديسات
الاسلاميه في فلسطين

د. محمد كرام الدين / الدار



تنظیم آزادی فلسطین

پاکستان افس، اسلام آباد

پاکستان افس شاعر امجد اسلام امجد نے فلسطینی شاعری کا اردو نظم میں ترجمہ کر کے اہل پاکستان کو دورِ حاضر کی عرب فلسطینی شاعری سے آگاہ ہونے کا جو موقع فراہم کیا ہے، تنظیم آزادی فلسطین کے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

فلسطینی عوام کا مسلح انقلاب، آزادی اور انصاف کے تحفظ کے لیے آج دنیا میں سب سے پیش پیش اور اگلے مورچوں پر سینہ سپر ہے۔ اور فلسطینی ادب چاہے وہ منشور ہو یا منظوم، اس جدوجہد کے خلوص اور سپائی کا آئینہ دار ہے۔

پاکستانی شاعر جناب امجد جس طرح سے فلسطینی جنگ آزادی کا یہ روشن شعلہ پاکستان عوام کے سامنے لے آئے ہیں، اُس نے اُن مشترکہ مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے جنہوں نے پاکستان اور فلسطین کے عوام کو ایک رشتے میں منسلک کر رکھا ہے۔

میں تنظیم آزادی فلسطین اور فلسطینی ادب کی طرف سے جناب امجد اسلام امجد کو ان کے اس کارنامے پر تشکر و تحسین پیش کرتا ہوں۔ ان کا یہ کام اس سچے احساس کی نمائندگی کرتا ہے جو پاکستان اور فلسطین کے لوگوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ فلسطینی اور پاکستانی ادبا کے درمیان مضبوط رشتے استوار ہوں گے، اور وہ مل کر انسانیت اور اپنی آزادی اور آبرو کے لیے لڑنے والی قوموں کے مسائل کے لیے جدوجہد کریں گے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی بدولت پاکستان کے قاری کو اس طویل اور پر مشقت جدوجہد کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوں گی جو ان کے فلسطینی بھائیوں نے ارضِ فلسطین میں، مقدس اسلامی آثار کی واپسی کے لیے، برپا کر رکھی ہے۔

علی حجاج

ناظم دفتر تنظیم آزادی فلسطین

اسلام آباد۔ پاکستان

فہرست

	امجد اسلام امجد
۹	عکس در عکس
۱۰	محمد کاظم
۱۳	مقدمہ
	عبدالوہاب البیاتی
۲۷	بکائیة الى شمس حزيران
۳۰	آفتاب جون کی نذر۔ ایک نوہر
	عبدالوہاب البیاتی
۳۳	مرثیة الى مدينة التي لم تولد . . .
۳۶	ایک شہر ناپید کا مرثیہ
	نزار قبانی
۳۸	حوار مع اعرابی اضاع فرسہ
۵۲	ایک بدو سے گفتگو جس کا گھوڑا کھو گیا ہے
	نازک الملائکہ
۵۸	الضیف
۶۰	مہمان

محمود درویش

۷۵ - - و یسدر الستار

۶۸ پردہ کرتا ہے

محمود درویش

۷۱ الدانوبُ لیس ازرق

۷۲ ڈینیوب نیلا نہیں ہے

محمود درویش

۷۶ قراءة فی وجه حبیبی

۷۸ چشمہ محبوب کی تحریر

محمود درویش

۸۰ امرأة جميلة فی سدوم

۸۲ شہر سدوم کی حسینہ

سیمح القاسم

۸۶ ما تیسر من سورة السلاسل

۹۲ ہاں چلے حلقہ زنجیر کی بات

سیمح القاسم

۹۵ قطرات دم علی خريطة الوطن العربی

۱۰۰ وطن عربی کے نقشے پر خون کے کچھ پھینٹے

فدوی طوقان

۱۰۶ جريمة قتل فی یوم لبس کالایام

۱۰۸ ایک، ایک دن میں وارداتِ قتل

عکس در عکس

”عکس“ میں شامل نظمیں میں نے گزشتہ چار برسوں میں ترجمہ کی ہیں۔ متن اور ترجمے کی موجودگی اور سید محمد کاظم صاحب کے اس زبردست مقدمے کے بعد اصولی طور پر میرے لیے کچھ کہنے کو باقی نہیں رہتا لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، ایک سفر کے اختتام پر جہاں اس کی ممکن خوشبو میں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، وہاں رستوں میں چھوڑی ہوئی منزلیں بھی ایک ایک کر کے آنکھوں میں تیر جاتی ہیں۔ یہ چند سطحا سی احساس کی عطا ہیں۔

میں نے یہ نظمیں ”ترجمہ برائے ترجمہ“ کی خاطر نہیں کیں۔ میرے سامنے ایک واضح مقصد تھا اور وہ یہ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر کے ایک شاعر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں شاعری کے ذریعے اپنے وطن، قوم اور عالمی انسانی برادری سے نہ صرف اپنا تخلیقی تعلق قائم کروں، بلکہ دنیا میں برپا عظیم اقداری کشمکش

میں بھی ترقی پسند، عوام دوست اور انقلابی قوتوں کا ساتھ دوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لیے میں نے شاعری کے ترجمے، اور خصوصاً فلسطینی شاعری کے ترجمے، کو کیوں اختیار کیا؟ پہلی بات کی وضاحت تو میں یوں کروں گا کہ میں خود شاعر ہوں اور شاعری کے ذریعے میرے لیے مسائل اور اشیاء کی افہام و تفہیم نسبتاً بہتر، جامع اور آسان ہے اور یوں بھی شاعری انسانی جذبات کی آواز بنے اور جذبے بہت کم جھوٹ بولتے ہیں۔ باقی رہی فلسطینی شاعری کے انتخاب کی بات تو وہ یوں ہے کہ ایک پاکستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے عالمی انسانی جدوجہد میں فلسطین میرے اپنے گروہ کی پہچان ہے اور فلسطینی عوام کی جدوجہد میرے لیے، پاکستان کے

بعد، سب سے اہم تاریخی استعارہ ہے۔ تیسری دنیا کے عوام کی سیاسی اور طبقاتی بیداری کے عمل میں بلاشبہ فلسطین تمام مسلمان ملکوں سے کہیں آگے ہے۔ میرے نزدیک اس عظیم انسانی جدوجہد میں مقدور بھر حصہ لینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے اور اپنے جیسے آدم زادوں کے خیالات ایک دوسرے تک پہنچائے جائیں۔ ان ترجموں میں فلسطینی عوام کی جدوجہد کی جو تصویریں آپ کو نظر آئیں گی، انہیں زمان و مکاں کی معمولی سی تبدیلی کے بعد آپ پوری تیسری دنیا میں کہیں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ترجمہ کیسے ہیں، اس کا فیصلہ تو اس کتاب کے قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی طرف سے انہیں بہتر اور خوب صورت بنانے کی بساط بھر کوشش کی ہے۔ اس دوران میں کچھ مہربانوں کے اُڑتے ہوئے جملے بھی مجھ تک پہنچتے رہے ہیں کہ جب شاعری ختم ہو جائے تو آدمی ترجمہ شروع کر دیتا ہے یا شاعری کا شاعری میں ترجمہ ممکن ہی نہیں ہے یا یہ کہ جو زبان مترجم کو پوری طرح آتی ہی نہیں اس سے وہ اچھا ترجمہ کس طرح کر سکتا ہے؟ اور یہ کہ میں نے ان ترجموں کو اپنی نظمیں بنا دیا ہے وغیرہ۔

میں ان اعتراضات کا کوئی جواب اس لیے نہیں دینا چاہتا کہ ہمارے یہاں بخندگی سے یکے جانے والے ہر کام پر اسی طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ تنقید کرنے والوں کی اس "اقلیت" کے پاس ایک ہی ہنر ہے اور میں انہیں ان کے واحد سہارے سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔

مجھے عربی زبان بہت دلچسپی سی آتی ہے۔ اس صورت میں شاید مجھے اس کام کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا، لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، میں نے اسے شوق سے زیادہ اپنا فرض سمجھا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ عرب شاعروں کے ہاں مجھے جذبات کی جو شدت اور خوب صورتی نظر آئی ہے اس کے پیش نظر ان نظموں کے بطن تک رسائی حاصل کرنا کم از کم مجھے کوئی خاص مشکل نہیں لگا۔ عربی سے براہ راست نثری ترجمہ جناب سید محمد کاظم صاحب نے کیے ہیں۔ انہوں نے صرف خوبصورت اور بلیغ نثری ترجمہ کرنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اپنی شدید

مسروقیات کے باوجود ہر نظم پر شعری ترجمے سے پہلے اور بعد میں کئی کئی گھنٹے مجھ سے تبادلہ خیال بھی کیا ہے اور اس طور ان کے متن کی صحت کو برقرار رکھنے اور ترجمے کو اصل نظم کے حدود میں پابند رکھنے کے سلسلے میں میری بے حد مدد کی ہے۔ اس عنایت کے لیے میں اپنے دل کی تموں سے ان کا ممنون ہوں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ فغلی ترجمے کے بجائے شاعر کے مافی الکلام کی ترجمانی کی جائے۔ اس طور یہ تراجم "آزاد ترجمے" کی ذیل میں آتے ہیں۔ اگر صاحبانِ نظر کے نزدیک کہیں کہیں آزادی ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہو تو معذرت خواہ ہوں اور ملتس ہوں کہ ایسے مقامات کی نشاندہی کر دی جائے تاکہ آئندہ اشاعت میں مناسب تصحیح کی جائے۔

میں مجلس ترقی ادب لاہور کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے اس کتاب کو اشاعت کے لیے انتخاب کیا۔

امجد اسلام امجد

۶۵۔ فلمنگ روڈ۔ لاہور

مقدمہ

یہ مجموعہ زمانہ حال کی عربی شاعری کا ایک مختصر، لیکن ایک اعتبار سے نمائندہ انتخاب ہے، جسے ہماری نوجوان نسل کے ذہین اور باصلاحیت شاعر امجد اسلام امجد نے اپنے ملک کے قارئین کے لیے اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ عربی شاعری کے ان منظوم ترجموں میں سے بیشتر زمانہ قریب میں ماہنامہ "فتون" اور "صحیفہ" اور روزنامہ "امروز" اور نوائے وقت کے صفحات پر شائع ہوئے تھے اور پڑھنے والوں نے ان کے اندر جذبے کا متوج، خیال کی ندرت اور اظہار کا ایک غزابت آمیز (Exotic) پیرایہ دیکھا، اور اس وجہ سے ان کو پسند کیا تھا۔ اب وہ سب نظمیں، کچھ اور نظموں کے اضافے کے ساتھ، اس کتاب میں یکجا پیش کی جا رہی ہیں۔

اس مجموعے میں شامل نظموں کو ہم جدید — بلکہ جدید تر عربی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن شکل یہ ہے کہ جدید، ایک اضافی اصطلاح ہے اور مروجہ زمانہ کے ساتھ اس کی تعبیر بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ لفظ 'جدید' کے استعمال سے بعض اوقات اچھا خاصا التباس Confusion بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ عربی شاعری کے ساتھ 'جدید' کی یہ صفت تقریباً ایک صدی قبل گنتی شروع ہوئی تھی اور اب ہم چلی آتی ہے! — ایک زمانے میں مصر کے محمود سامی البارودی (۱۸۳۹-۱۹۰۴ء) 'جدید' کہلائے تھے، بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک

طویل عرصہ، انحطاط کے بعد عربی شاعری کی نشاۃ ثانیہ انہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی محمود سامی البارودی اور اسماعیل مبرہ (۱۸۶۱ء - ۱۹۲۳ء) کا عہد تھا، جس میں عربی شاعری نے پانچ سو برس کے عرصہ خوابیدگی Hibernation کے بعد انگڑائی لی تھی، اور بارودی کی نظمیں اپنے محاورے اور حسنِ بندش میں عباسی دور کی شاعری کی یاد دلانے لگی تھیں۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ بارودی اور مبرہ بھی پرانے ہو گئے اور جدید عربی شاعری اب وہ کلماتی جو مصر کے احمد شوقی اور حافظ ابراہیم، لبنان کے خلیل مطران اور عراق کے معروف الرصافی کا طرزِ سخن تھی۔ ان لوگوں نے عربی شاعری کی اس نئی روایت کو آگے بڑھایا اور بلاغتِ لفظ کا دامن حسنِ خیال سے باز دھتے ہوئے اس میں اظہار کے ایسے خوب صورت تجربے کیے کہ دنیائے ادب میں عربی شاعری کا کشمیر ہوا وقار بحال ہو گیا۔ شاعروں میں احمد شوقی (۱۸۹۸ - ۱۹۳۲ء) کا جینس اپنے ہم عصروں کے درمیان اسی طرح نمایاں اور قد آور ہے جس طرح ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ کا ہے (اور اتفاق سے ان دونوں کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی ہے)۔ شوقی کے بعد لوگ سوچتے تھے کہ فن کی اس معراج پر پہنچ جانے کے بعد اب شاعری کے لیے کون سے افلاک باقی رہ گئے ہیں جنہیں یہ مسخر کرے گی۔ لیکن جب تک انسان کی تقدیر میں ارتقا لکھا ہے، اس کی شاعری ہو یا کوئی دوسرا فن، اس میں آخری منزل کبھی نہیں آ سکتی؛ چنانچہ زمانے نے کروٹ لی تو شوقی اور حافظ پر بھی وقت کی گردِ جمنے لگی، ادب کے افق پر اب کچھ دوسرے اصحابِ سخن نمودار ہوئے، جنہوں نے عربی شاعری کو ایک نیا لحن اور ایک تازہ لب دلجو دیا۔ جبران خلیل جبران، میخائیل نعیم، ایلیا ابو ماضی اور الیاس ابو شکر — یہ سب لبنان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر اپنے وطن سے ہجرت کر کے یورپ اور امریکہ میں جا بے۔ اور شعراء المہجر (ہجرت کے شعراء) کہلائے۔ زندگی کے مغربی سانچے اور سوچ و فکر کے انگریزی اور فرانسیسی انداز نے ان لوگوں کے واسطے سے عربی شاعری کو نمایاں طور پر متاثر کیا اور اپنے

زمانے میں ان لوگوں کا حلقہ بھی بجا طور پر شاعری کا جدید سکول 'قرار پایا۔ تجدّد و ارتقا کا یہ دھارا اس طرّت و قوت کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے اور ہر جدید شاعر اور ایک جدید تر شاعر کے لیے جگہ خالی کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس صدی کی وسطی دہائیوں میں کچھ اور نام مثلاً احمد زکی ابو شادی، عبدالقادر القبط، محمود حسن اسماعیل، علی محمود طر اور ابو القاسم الشابی وغیرہ ہمارے سامنے روشنی میں آتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اپنی آب و تاب دکھا کر گزر جاتے ہیں اور ہم وقت کی گردش کے ساتھ بالآخر اس قریبی زمانے میں آنکلتے ہیں جو گزشتہ پندرہ یا بیس برس سے شروع ہو کر اب تک چلا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہم بالکل ہی دوسری طرح کی اور اچھوتی آوازیں سننے لگتے ہیں۔ یہ عبدالوہاب البیاتی، نزار قبانی، نازک الملائکہ اور محمود درویش جیسے شعرا کی آوازیں ہیں۔ ایک نئے عہد کی شاعری، ایک جدید آہنگ اور اسلوب لیے ہوئے! جو ساری پچھلی شاعری سے نہ صرف موضوع و مضمون بلکہ ہیئت میں بھی مختلف ہے اور جس کے ساتھ عربی شاعری ایک ایسا موڑ مڑ چکی ہے کہ اس سے پہلے کی تمام شعری روایت موڑ کے اُس طرف کی چیز بن کے رہ گئی ہے۔

گزشتہ ایک صدی کی عربی شاعری کے اس سرسری سے جائزے سے آپ یہ دیکھیں گے کہ جہاں ایک حوالے سے محمود سامی البارودی کی شاعری بلاشبہ 'جدید عربی شاعری' کہلائے جانے کے مستحق ہے وہاں ایک دوسرے ضمن میں بعد میں آنے والے مہاجر شعراء بھی 'جدید' نہیں کہلاتے، بلکہ دوسروں کے ساتھ ان کو بھی اب 'ماضیین' (گزرے ہوئے) کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس مجموعے کی نظموں کو جدید عربی شاعری کہنے کی بجائے زمانہٴ حال کی عربی شاعری کہنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ یہ اس زمانے کی شاعری ہے جس میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ ان نظموں کی ایک بڑی تعداد ۱۹۶۰ء یا اس کے بعد کے عرصے میں لکھی گئی ہے اور ایک نظم (فدویٰ طوقان کی 'ایک انوکھے دن میں وارداتِ قتل') اسی سال ۱۹۶۵ء کے اوائل میں شائع ہوئی ہے۔

آج کی عربی شاعری کے ان نمونوں میں پڑھنے والے کو ایک خاص ربط اور ہم آہنگی دکھائی دے گی، اور وہ یہ کہ یہ تقریباً سب کی سب نظمیں زیادہ تر راست اور کہیں کہیں بالواسطہ انداز میں اس مزاحمتی رویے کی نمائندگی کرتی ہیں جو عربوں نے صیہونیت کی تحریک کے خلاف گزشتہ پچیس تیس برس سے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ رویہ آج عرب محب وطن کی سیاسی بیداری اور قومی غیرت کا عنوان ہے، اور اگرچہ وہ منزل جہاں وہ اپنے اس رویے کے سہارے پہنچنا چاہتا ہے، ابھی آنکھوں سے اوجھل ہی ہے اور اس کی راہ روز بروز دشوار ہوتی جاتی ہے تاہم وہ اپنی مزاحمت (Resistance) اور بغاوت میں آج بھی اسی طرح مخلص، پرجوش اور ثابت قدم ہے جس طرح وہ پہلے دن تھا۔ صیہونیت کی اس تحریک نے عربوں کو صدیوں کے عافیت پسندی اور آسودہ خوابی سے جھنجھوڑ کر بیدار کیا ہے۔ وہ آنکھ ملتے ہوئے اٹھے ہیں، لیکن افسوس کہ اُس وقت جب ایک غاصب ان کی سرزمین میں اپنے پاؤں بہت گھرے جا چکا تھا، اور سیاسی اور اقتصادی سطح پر اس نے اپنے لیے دنیا کی بڑی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ بیس برس کے عرصہ میں عربوں نے تین مرتبہ اپنی قوت مجتمع کر کے صیہونی ریاست اسرائیل سے ٹکری، لیکن ہر دفعہ انہیں شکست کھا کر پسا ہونا پڑا۔ اپنے مذہب کی برتری اور قوت ایمانی پر نازاں یہ عرب لوگ کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے درمیان تین طرف سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی یہودی مملکت ان کے لیے ایک ناقابل تسخیر قلعہ ثابت ہوگی اور ہر نئی جنگ کے بعد اُس کی سرحدیں پھیلتی چلی جائیں گی۔ حالات کے اس کمٹور پن نے عربوں کو شکستِ فریبِ نظر Disillusionment سے دوچار کیا ہے اور انہیں دک اٹھانے کے بعد اس حقیقت کا ادراک ہوا ہے کہ آج کی اس دنیا میں پنپنے اور اپنے ملک کو غاصبوں کی دست برد سے بچانے کے لیے محض مذہبی احساسِ برتری، نسلی تفاخر، جوششِ جذبات اور کثرتِ تعداد کافی نہیں۔ اس کے لیے کچھ دوسری طرح کے قومی خصائص اور تربیت و انضباط کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان چیزوں میں ان کا حریف ان سے یقیناً

زیادہ سچ ہے! — عربوں کی جو نسل آج شعور کی پختگی کو پہنچی ہوئی ہے وہ اپنی زندگی میں شکستِ سحر کی ان سب منازل سے گزر کر آئی ہے۔ اس نے ادائلِ عمر میں اپنے بڑوں کے وہ پُر شور نعرے بھی سنے تھے کہ ہم اسرائیل کو اپنے قدموں تلے روند ڈالیں گے اور اسے صنوبرِ ہستی سے شاکر دم لیں گے، اور پھر اپنی آنکھوں سے اس نے مہر کا یہ دوسرا رخ بھی دیکھا کہ اسرائیل نے حملہ کر کے ہفتے کے دنوں سے بھی کم عرصے میں عربوں کی فوجی طاقت کو مفلوج کر کے رکھ دیا، ان کے کچھ اور علاقے اپنے قبضے میں کر لیے اور کچھ مزید فلسطینی عربوں کو اپنے گھر بار اور اہلک چھوڑ کر مہاجر بننے اور در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ اس وجہ سے آج کی عربی نسل ایک گھائل شخصیت کی نسل ہے۔ صہیونیت کے ہاتھوں اس کے قومی تشخص اور اس کی نسلی غیبت و حیست کو ایسے کاری زخم لگے ہیں جواب تک ہرے چلے آتے ہیں اور ان سے برابر خون رس رہا ہے۔ فلسطینی شاعر محمود درویش اپنی ایک تانہ نظم میں کہتا ہے:

یہ سمندر پھیلا ہے

بیچ آسمان کے اور میرے دہن زخم کے

اور میں ایک ایسے افق کی سمت چلا ہوں

جو ہم پر جھکا ہے

جو ہمارے لیے مصروفِ دعا ہے!

محمود علامات کا شاعر ہے۔ اس ٹکڑے میں سمندر، آسمان، افق وغیرہ الفاظ کی ایک سے زیادہ تعبیریں کی جاسکتی ہیں، لیکن دہن زخم کا اشارہ ایک ہی چیز کی طرف ہے، اور وہ ہے شاعر کا وطنِ مسلوب اور اس کا وہ المیہ جس کی تمبیں وہ اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔

صہیونیت کی تحریک سے کیا مراد ہے؟ اس کی نشوونما کیسے ہوئی، اور پھر یہ فلسطین میں اگر کیوں کر آکاس بیل کی طرح سارے علاقے پر پھیل گئی؟ اس بارے میں اپنی معلومات

تازہ کرنے کے لیے یہیں تھوڑی دیر کے لیے تاریخ میں کچھ پیچھے تک جانا پڑے گا۔
 صیونیت کا لفظ صیون Zion سے نکلا ہے جو شہر یروشلم کے نواح میں واقع دو پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی کا نام تھا۔ یہ پہاڑی نامہ قدیم سے اس مقام پر موجود تھی۔ پھر جب اس کے دامن میں یروشلم کا شہر آباد ہوا تو اس شہر کو دختر صیون کہا جانے لگا۔ صیتون کا لفظ (جو عربی میں اگر صیون ہوا) عہد نامہ قدیم میں ڈیڑھ سو سے زائد مقامات پر آتا ہے۔ کتاب یسعیاہ میں ایک جگہ مذکور ہے:

”... بلکہ بہت سی امتیں آئیں گی اور کہیں گی اُو خداوند کے پہاڑ پر چڑھیں، یعنی یعقوب کے خدا کے گھر میں داخل ہوں اور وہ اپنی راہیں ہم کو بتائے گا اور ہم اس کے راستوں پر چلیں گے۔ کیونکہ شریعت صیتون سے اور خداوند کا کلام یروشلم سے صادر ہوگا۔“

اسی طرح کتاب نوہ میں یروشلم کی تباہی کے ضمن میں آتا ہے:

”صیتون کی راہیں ماتم کرتی ہیں کیونکہ عید کے لیے کوئی نہیں آتا... دختر صیتون کی سب شان و شوکت جاتی رہی... دشمنوں نے اسے دیکھ کر اس کی بربادی پر ہنسی اُڑائی۔ یروشلم سخت گناہ کر کے غم ہو گیا۔“

انجیل میں صیتون کا ذکر جہاں جہاں اور جس طرح سے آتا ہے اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کی مذہبی روایت میں صیتون اور یروشلم کو تقریباً وہی حیثیت حاصل تھی جو اسلام میں مکہ مکرمہ اور اس کے نواحی مقامات منیٰ اور عرفات وغیرہ کو حاصل ہوئی۔ یروشلم میں معبد سلیمان بھی تھا جو یہودیوں کے لیے مرکزی اور مقدس ترین عبادت گاہ تھی فلسطین کا علاقہ اس زمانے میں سلطنتِ روم کے زیرِ اقتدار تھا، اور سلطنت کے دورِ افتادہ حصوں میں رومی لند

کے خلاف جو بنفاد میں سرچٹائی رہتی تھیں ان میں یہودی بھی شامل ہونے لگے تھے۔ ان کے اس رویے سے براہِ فروختہ ہو کر سن ۷۰ بعدِ مسیح میں رومی فوجوں نے یروشلم پر چڑھائی کر دی، شہر کو ماتحت و تاراج کیا اور معبدِ سلیمان کو جلا کر راکھ کر دیا۔ سن ۶۳۱ء میں قیصر ہیزیرین نے معبد کی تعمیر نو کا حکم دیا، لیکن انہی دنوں روم کے خلاف ایک اور بنفادت ہوئی اور یہودی اس میں بھی طوٹ پائے گئے۔ اس پر ہیزیرین نے ان کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کرنے کی ٹھانی۔ اس نے باغیوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا، ان کے شہر کو سہارا کر کے جلے کا ڈھیر بنا دیا، اور سب یہودیوں کو حکم دیا کہ یروشلم سے ہمیشہ کے لیے نکل جائیں اور آئندہ کبھی اس سرزمین کا رخ نہ کریں ورنہ ان کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ آگے چل کر انھیں صرف اس امر کی اجازت ملی کہ سال میں صرف ایک دن — ۹ اگست کو — یروشلم میں آکر معبدِ سلیمان کی تباہی کی برسی منائیں اور ایک مقررہ رستم ادا کر کے معبد کی دیوار کے ساتھ لگ کر نوحہ و بکا کرنے کا حق حاصل کریں۔

یروشلم کی تباہی اور اپنی جلاوطنی کے بعد یہودی قوم یورپ کے مختلف حصوں میں بکھر کے رہ گئی۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی تھے، فلسطین میں واپس آنے کی آرزو ان کے ایمان کا جزو اور ان کی زندگیوں کا خواب بنی رہی۔ اسی خواہش کی تکمیل میں اور محض مذہبی اغراض کی خاطر، بیسویں صدی کے اوائل میں کچھ یہودی لوگ فلسطین میں آکر رہنے لگے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے تک ایسے یہودیوں کی تعداد اسی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

انیسویں صدی کے آخر سے ’صیونیت‘ جو اس سے پہلے محض یروشلم واپس جانے تک ایک سوہوم سی خواہش کا نام تھا، ایک باقاعدہ عالمی تحریک کی صورت اختیار کرتی ہے اور اسے یہ شکل دینے میں اولیٰت ایک جرمن شوشلسٹ مونسٹر میٹس کو حاصل ہے۔ اس کے بعد یوہنسنک نے جو اڈیسر (یوکرین) کا ایک طبیب تھا، جرمن زبان میں مغربی یورپ کے یہودیوں

کے نام ایک اپیل شائع کی کہ بھری ہوئی یہودی اُمت کو تباہی سے بچایا جائے مغربی یورپ میں تو یہ اپیل کوئی بازگشت پیدا نہ کر سکی، لیکن روس میں "مہجانِ صیہون" *Houvei Zion* کے نام سے ایک چھوٹا سا گروہ اس کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ اس کے بعد اس تحریک کے سلسلے میں ایک اور اہم نام "آشر گنز برگ" کا آتا ہے، جس نے "یکے از مردمان" *Ahad Haan* کے قلمی نام سے صیہونیت کے تصور پر متعدد اہم مضامین لکھے۔ لیکن گنز برگ جیسا صیہونی رہنما اور مفکر سبھی فلسطین کو یہودیوں کے لیے محض ایک ثقافتی مرکز بنانا چاہتا تھا اور اس امکان کا قطعی منکر تھا کہ فلسطین میں مقامی آبادی کو بے دخل کر کے اس میں یہودی اکثریت کو بسایا جاسکتا ہے۔ اس طرح سفر کرتے ہوئے یہ تحریک ایک "آسٹرین صہانی تھیوڈور ہرزل تک پہنچی، جس نے ۱۸۹۶ء میں "دُمنِ یہود" *Der Judenstadt* کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا، اور پھر اگست ۱۸۹۶ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل میں پہلی صیہونی کانگریس بلائی۔ ہرزل کے بعد تحریک کا مرکز برلن منتقل ہو گیا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ مرکز لندن آ گیا، جہاں اس کی سربراہی ان روسی یہودیوں (کائم و ایتسمن اور ناہوم سوکولوف) کے ہاتھ میں آئی جو اس وقت وہاں مقیم تھے۔ صیہونیت نے اب ایک فعال عالمی تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی جسے مالی امداد امریکہ کے یہودی میتا کرنے لگے تھے اور جس کے لیے کارکن اور رضا کار پولینڈ اور دوسرے یورپی ملکوں میں منظم ہو رہے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے سے یوں لگتا ہے جیسے تحریک صیہونیت کو اپنی منزل مقصود تک پہنچانے اور فلسطین میں یہودیوں کا وطن قائم کرنے کی ساری ذمہ داری حکومتِ برطانیہ

۱ Asher Ginzberg (1856-1927)

۲ Theodor Herzl

۳ Claim Weizmann, Nahum Sokolow

نے اپنے کندھوں پر لے لی تھی۔ بیسویں صدی کے اس حصے کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہم سب کے سامنے گزرا ہے، اس لیے اس عرصے کے واقعات کا استقصاء کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی، تاہم یاد دہانی کے طور پر چند اہم اور نمایاں واقعات کا تذکرہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا:

- — انیسویں صدی میں اور پہلی جنگ عظیم کے زمانے تک عرب علاقے سلطنت عثمانیہ کے زیرِ نگیں تھے۔ جنگ عظیم کے خاتمے پر یہ اس سے کٹ کر الگ ہو گئے اور انھیں ریاستوں میں تقسیم کر کے انجمن اقوام کی نگرانی میں برطانیہ اور فرانس کے انتداب Mandate میں دے دیا گیا۔ برطانیہ کے حصے میں عراق، اردن اور فلسطین کی ریاستیں آئیں، اور فرانس کے حصے میں شام اور لبنان!

- — ۱۹۱۷ء میں، جب کہ جنگ ابھی جاری تھی، برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور نے اعلان کیا کہ اس کی حکومت یہودیوں کے لیے فلسطین میں وطن قائم کرنے کی تائید کرتی ہے۔ چند سال بعد انجمن اقوام نے بھی صیونی مقاصد کی حامی بھری اور برطانیہ کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوا کہ وہ اپنے انتداب کے پچیس برسوں (۱۹۲۳ء تا ۱۹۴۸ء) میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنائے۔

- — پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دہائی میں یہودیوں کی فلسطین میں آمد کا سلسلہ جاری رہا، اور ہر سال تقریباً آٹھ ہزار یہودی اس ملک میں آکر آباد ہوتے رہے۔ لیکن جب جرمنی میں ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اس تعداد میں کمی گنا اضااف ہو گیا۔ صرف ۱۹۳۵ء میں باسٹھ ہزار یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے۔ فلسطینی عربوں نے یہودیوں کے یوں اُمنڈ کر آنے پر کافی احتجاج کیا۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں ملک میں بڑے پیمانے پر ہڑتائیں اور فسادات ہوئے، لیکن ان کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بڑی طاقتوں نے فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز کی۔ لیکن یہ نہ عربوں

کو منظور ہوئی، نہ یہودیوں کو۔

● — ۱۹۴۷ء میں، جب کہ فلسطین میں برطانوی انتداب کا ایک سال باقی تھا، برطانیہ نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ کے سپرد کر دینے کا اعلان کیا۔ اقوام متحدہ میں فلسطین کو تقسیم کر دینے کی تجویز پیش ہوئی، جس کی رو سے ملک کا دو تہائی حصہ یہودیوں کے سپرد کیا جانا تھا اور ایک تہائی حصہ ہمسایہ عرب ریاستوں میں ضم کیا جانا تھا۔ یہودیوں کے لیے یہ تقسیم قابل قبول تھی، لیکن عربوں نے اسے مسترد کر دیا۔

● — مئی ۱۹۴۸ء میں برطانوی انتداب کے اٹھتے ہی یہودیوں نے فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا، جس کی حدود وہی تھیں جو اقوام متحدہ نے تجویز کی تھیں۔

● — اس کے منابعد ہمسایہ عرب ریاستوں نے اسرائیل پر حملہ کر دیا لیکن مقابلے میں شکست کھائی۔ فروری ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی عمل میں آئی اور اسرائیل نے عربوں کے جو علاقے فتح کیے تھے۔ ان میں سے کچھ واپس کیے، لیکن کچھ اپنی مملکت میں شامل کر لیے۔ اس جنگ کے نتیجے میں فلسطین کے دس لاکھ عرب باشندے گھر سے بے گھر ہو کر مہاجر بن گئے۔ ان میں سے کچھ آج کوکرت میں ہیں کچھ لبنان میں اقوام متحدہ کے نصب کیے ہوئے مہاجر کیمپوں میں زندگی گزار رہے ہیں اور کچھ لاطینی امریکہ میں جا بسے ہیں۔

● — ۱۹۵۶ء میں مصر، اردن اور شام نے ایک مشترکہ کمان قائم کر کے اسرائیل پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور جنوب میں خلیج عقبہ کو جانے والے اس کا تجارتی راستہ بند کر دیا۔ اسرائیل نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے صحرائے سینا پر حملہ کیا اور پانچ دن میں اسے فتح کر لیا۔ بعد میں بڑی طاقتوں کے دباؤ کے تحت اسرائیل

کو اپنے علاقے کو واپس جانا پڑا۔ اُسی زمانے میں برطانیہ اور فرانس نے سویز پر حملہ کیا، لیکن جمال عبدالناصر نے جم کر مقابلہ کیا اور ان کے عزائم کا سب نڈھونے دیے۔

جون ۱۹۶۷ء کی چھ یومی جنگ میں اسرائیل نے ۱۹۵۶ء کا عمل دہرایا، اور مصر، اردن اور شام پر بیک وقت حملہ کر کے پانچ دن میں ایک طرف صحرائے سینا فتح کر لیا، اور دوسری طرف شہر یروشلم کا مسلم حصہ بھی اپنے قبضے میں کیا، اور دریائے اردن کا مغربی کنارہ اردن کی افواج سے خالی کر لیا۔ اقوام متحدہ کے بیچ بچاؤ سے جنگ بندی عمل میں آئی، لیکن پورا صحرائے سینا اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔

نومبر ۱۹۴۳ء میں چوتھی مرتبہ اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان ایک بڑی جنگ ہوئی، جس کے نتیجے میں مصر نے سویز کے مشرقی کنارے پر صحرائے سینا کا کچھ علاقہ واپس لے لیا اور دوسرے محاذوں پر بھی عرب افواج نے پہلے کی نسبت بہتر قوتِ مدافعت کا ثبوت دیا۔ اس جنگ کے حالات اور بعد کے واقعات زمانہ حال کی چیز ہیں، اور ہم سب کے سامنے ہیں۔

صیونیت کے ارتقاء اور عرب اسرائیل کشمکش کا یہ بیان اختصار کی کوشش کے باوجود قدرے طویل ہو گیا۔ لیکن تفسیرِ فلسطین اور عربوں کے جذباتی اور ذہنی رویے پر اس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے واقعات کے اس سارے سلسلے کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہو گا۔ گذشتہ ربع صدی کی یہ تاریخ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس نے عربوں کی نئی نسل کے مزاج، ان کی سوچ کے انداز، ان کے ادب اور خصوصیت کے ساتھ ان کی شاعری کو بنیادی طور پر متاثر کیا ہے!

عربی شاعری میں فلسطین کا ذکر اس زمانے سے آنے لگا ہے جب جنگِ عظیم

اول کے دنوں میں بالفور کا اعلان منظرِ عام پر آیا تھا، اور جنگ کے ختم ہوتے ہی فلسطین میں یہودیوں کی آمد روزمرہ کا معمول بن گئی تھی۔ اس وقت کے سب مشہور شعراء مثلاً عبد المحسن الکاظمی، رشید سلیم الخوری، محمد علی الحوامی، ابراہیم طوقان، امین ناصر الدین، بشارة الخوری، احمد محرم اور علی المجارم نے فلسطین کی تشویش ناک صورتِ حال کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا تھا، اور بعض شعراء کے ہاں ان نظموں کی تعداد اتنی تھی کہ ان کے دیوانوں میں وہ فلسطینیات کے عنوان سے ایک علیحدہ باب کی صورت میں درج ہوتی تھیں۔ بالفور کے اعلان کے بارے میں رشید سلیم الخوری کا یہ شعر آج بھی لوگوں کو یاد ہوگا:

لو كنت من اهل المكالم لم تكن
من جيب غمرك محسناً يا بلفر

(اے بالفور! اگر تو باکردار لوگوں میں سے ہوتا تو دوسروں کی جیب کاٹ کر
یوں نوازشیں نہ کرتا)

اور علی المجارم نے وقت سے بہت پہلے اپنی شاعرانہ بصیرت سے یہ دیکھا کہ فلسطین میں
انڈس کی تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے، چنانچہ اس نے اہل فلسطین کو باہم متحدہ رہنے
کی تلقین کی اور انھیں مغرب کی ریشہ دوانیوں سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ شاخِ گل کے
سائے میں بعض اوقات افنی بھی چھپا ہوتا ہے:

لقد اعدا بها التاريخ الدلساً
اخرى و طاف بها للشمر طوفان
بنی فلسطین کولوا امه و بدأ
قد یختفی فی ظلال الورد نعبان

آگے چل کر جب اسرائیل کی مملکت وجود میں آئی اور اس نے ۱۹۴۹ء میں پہلی بار عرب ریاستوں کو میدانِ جنگ میں نیچا دکھایا تو اس کا ایک شدید اور ہرگز ردِ عمل عرب عوام میں یہ ہوا کہ ان کا اعتماد اپنے اس وقت کے سربراہانِ مملکت اور ان کے نظامِ ملکی Organization سے اُٹھ گیا۔ مصر میں شاہ فاروق کی معزولی اور جمال عبدالناصر کا ظہور اسی بے اعتمادی اور اس سے پیدا ہونے والے جذبہٴ بغاوت کا نتیجہ تھا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں واقع ہونے والے اس فوجی انقلاب نے نہ صرف مصر میں، بلکہ تمام عرب دنیا میں انقلاب کا دلولہ پیدا کر دیا، اور سیاست کے علاوہ ادب اور فن کے میدانوں میں بھی 'الثورة' (الثورة) (انقلاب) کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ 'الادب الثوري' اس ادب کو کہا جانے لگا جو اپنے اندر انقلابی روح رکھتا ہو، جو حالتِ موجودہ میں تغیر لانا چاہتا ہو!۔ اور یہ سارا انقلاب اور یہ جذبہٴ بغاوت صرف بیرونی غاصب کے مقابلے میں ہی نہیں تھا، بلکہ اس کا ہدف، اتنی ہی شدت کے ساتھ، خود عربوں کے اندر کے کاہل، رجعت پسند اور تخریبی عناصر بھی تھے! شاعر چونکہ اپنے معاشرے کا سب سے حساس فرد ہوتا ہے، فلسطین کی اس دل خراش صورتِ حال سے عرب شعرا نے بہت گہرا اثر لیا۔ نتیجہً عربی شاعری کا مزاج اور موضوعات بدلنے لگے۔ ایسے شعراء جو پہلے اپنی ذات کے ساحل کی تلاش میں وقت کے دھارے پر حیران اور خاموش بتے چلے جاتے تھے، اور زندگی کے بارے میں جن کا نقطہٴ نظر کہیں دومانی ہوتا تھا اور کہیں مثالی، اب حقائق کی زمین پر اتر آئے اور 'مأساة' (ایسے) کی شاعری کرنے لگے۔ اس ایسے سب سے زیادہ اور براہِ راست متاثر ہونے والے خود فلسطینی شعراء تھے جو جنگ اور قتل و غارت گری کے جنم سے گزر رہے تھے اور جنہوں نے اپنے عزیزوں اور بہوٹوں کو گھر بار اور کھیتوں سے بے دخل ہو کر اس قلعے میں شامل ہوتے دیکھا تھا جس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی ادب سے بالآخر سماج کی پیوں میں جا کر ایک طویل اور غمناک عرصے کے لیے مقیم ہونا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری پر اس تبدیلی کا عمل زیادہ فوری اور زیادہ واضح

دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر فلسطین کا ابوسلمی 'مأساة' سے پہلے و بعدانی شاعر عتار جیسے ہر خوب صورت چیز سے عشق تھا، جو حسن کی پرستش کرتا تھا، اور اپنے شعروں میں چاند اور درختوں اور پھولوں سے ہم کلام ہوتا تھا، لیکن ایسے کے بعد وہ طنز (پابند مقصد) شاعری کرنے لگا، اور اس کی زمین — فلسطین — ہی اس کے جذبے اور خیال کا مرکز بن کر رہ گئی۔ اس کے 'تازہ دیوان کا نام ہے 'من فلسطین رشتی' (میرے بال و پر فلسطین سے نکلے ہیں) اور اس کا جو دیباچہ آج کے نوجوان شاعر محمود درویش نے لکھا ہے اس کا عنوان ہی یہ ہے کہ:

انت الجذع الذی نبتت علیہ اغانینا -

(تو وہ شاخ ہے جس سے ہمارے نمنوں کے شگوفے پھوٹے ہیں)۔

یہی حال فلسطینی شاعرہ فدوی طوقان کا ہے، جو پہلے اپنے اندر کی خواب ناک دنیا میں کھوئی رہتی تھیں؛ کبھی اپنے جذبات کو بے لگام کرتی ہوئی اور کبھی اپنے وجود کے اندر اتر کر اپنے آپ کا کھوج لگاتی ہوئی! وہ ہمیشہ سے رومان اور عشق کی شاعرہ مشہور تھیں اور ان کے پہلے تین دیوانوں کا بنیادی موضوع ہی 'محبت' تھا۔ لیکن جو کچھ ان کی آنکھوں نے اپنے بچے اور لڑے ہوئے دیار میں دیکھا اس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے معاملات دل کو ایک طرف رکھ کر حقیقت اور واقعے کی بات کریں:

ا پر اٹھتے اور لہراتے ہوئے دھوئیں میں سے میں نے جھانکا، تو وہ حویلی اجلا اور دیران

پڑی تھی اور اس کی دھیسز پر کیڑوں اور چیونٹیوں کے قافلے رواں تھے

اہ! وہ کٹے ہوئے ہاتھ اور بازو، جو راہوں میں بکھرے تھے، اور وہ دیدوں کے

نکے مٹی میں رتے ہوئے!

اور چہرے جو مٹی میں مل کر اور زیادہ میٹھے ہو گئے تھے!

لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ اس پہلی شکست

کے بعد 'مأساة' کے زیر اثر ہونے والی ساری شاعری فن کا اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتی

مختی، بلکہ اس کی ایک بڑی اکثریت میں سطحی جذباتیت، میلوڈراما، صحافتی انداز کا جوش و خروش اور ان ساری چیزوں کے پیچھے ایک بے حد مایوس اور ماتمی لہجہ دیکھنے میں آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صدرہ بالکل تازہ اور براہ راست تھا۔ وہ ابھی شاعر کی ذات میں گمراہ کر رہا بسا نہیں تھا۔ اس کا نفسیاتی تجربہ نہیں بنا تھا کہ شاعر اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھتا اس میں ایک عمیق احساس اور فنی پختگی پائی جاتی۔ ایک دوسری وجہ اس صورت حال کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فلسطین کا مسئلہ ان ابتدائی برسوں میں ایک غیر متعین اور سیال Fluid حالت میں تھا۔ شاعر کو کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آگے چل کر کیا کیا ہونے والا ہے، اس لیے اس مسئلے کی بابت وہ ابھی تحیر اور شش و پنج کی حالت میں تھا۔ اس زمانے کی شاعری کوئی شک نہیں کہ بناوٹ اور آرائش سے پاک، خلوص اور سچائی کی شاعری ہے، لیکن اس میں گمراہی نہیں ہے، وسعت نظر نہیں ہے، تصور و خیال کی اُچک نہیں ہے، وہ پختگی اور رچاؤ نہیں ہے جو کسی تجربے کے شاعر کی ذات میں پوری طرح جانب ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ فلسطین مہاجروں کی حالت زار کا بھی نقش آنکھ یا کان کی راہ سے شاعر کے ذہن پر مرسم ہوتا تھا، وہ اُسے جو ہوشعر کی صورت میں سوزوں کر دیتا۔ اس ضمن میں شاعر عراق کے شاعر ابراہیم الوائلی کی کھینچی ہوئی یہ تصویر بہت دکھ بھری اور المناک دکھائی دے گی:

اور ایک طفل شیر خوار جب بھوک سے ملبلا تا ہے تو آنسوؤں کے قطرے
اس کی غذا بنتے ہیں۔

سینہ مادر کو جب وہ اپنے ہاتھوں سے پھوڑتا ہے تو اس سے بجائے
دودھ کے خون کی دھار بہ نکلتی ہے۔

لیکن یہ حالات کی ایک بیانیہ منظر کشی ہے، ایک کیمرے کی تصویر، جس میں شاعر
میں فکر و خیال کا عنصر دکھائی نہیں دیتا۔

تقریباً اسی زمانے میں شاعری میں ایک بڑے انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ یہ ”الشعر المخر“ (آزاد شاعری) کے وہ نئے تجربات تھے جو صنفِ اول کے چند ایک شعراء (عراق کی نازک الملائکہ اور بدر شاہرکیسیاب) نے کیے اور جنہوں نے عربی شاعری میں اظہار کے امکانات کی ایک نئی دنیا کا دروازہ کھول دیا۔ اس وقت یہ کہنا تو شاید مشکل ہو کہ یہ تجربات محض مغربی شاعر کی جدتوں سے متاثر ہو کر کیے گئے تھے، یا شاعروں نے بدلی ہوئی قومی اور سماجی صورتِ حال میں اپنے دل کی بات کھل کر کہنے کے لیے ”الشعر العمودی“ یا ”الشعر المقفی“ (پابند شاعری) کو مناسب حال نہ پایا تھا، اور ایک قدرتی اور بے محابا جذباتی کیفیت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچنے کے لیے انھوں نے آزاد شاعری کا راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری کی اس نئی ہیئت نے بغاوت اور انقلاب کی اس تحریک کو ایک دلچسپ اور مؤثر ذریعہ اظہار مہیا کر دیا جس کا اس وقت ہر طرف چرچا تھا، اور رفتہ رفتہ آزاد شاعری ”الثورة“ (انقلاب) کی لسانِ راقی بن گئی، اور روایت پسند نقادوں کے احتجاج اور انکار اور مسخر کے باوجود اس کی مقبولیت اور رواج میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس زمانے کے شاعروں کی ایسی نسل نے، جو عمر میں کچھ بڑی اور تجربہ کار تھی، آزاد شاعری کو بڑی رغبت سے اپنایا اور کچھ عرصے تک دونوں طرح کی (یعنی پابند اور آزاد) شاعری کرنے کے بعد بالآخر روایتی شاعری کو خیرہ آباد کہا اور اس نئی انقلابی شاعری کے ہو رہے۔ ۱۹۵۵ء میں بیروت کے ممتاز ادبی مجلے ”الآداب“ نے الشعر المحدث (جدید شاعری) کے عنوان سے جب اپنا ایک خاص نمبر نکالا، تو اس میں آزاد شاعری کا ایک پتہ مقفی شاعری کے مقابلے میں واضح طور پر بھاری تھا اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا تھا کہ مستقبل میں شاعری کی کون سی ہیئت زندہ رہنے اور پنپنے والی ہے۔

ایک طرف آزاد شاعری نے اظہار کے امکانات کو بے حساب وسعت دی اور اس لیے سخن کی نئی نئی راہیں شعراء کو سنبھالیں، اور دوسری طرف عرب شعراء کی وہ نسل، جو ۱۹۴۸ء

کے لیتے کے وقت ابھی نا تجربہ کار یا روحانی اور غیر ذمے دار تھی، حالات اور تجربات کی آپہنچ سے گزر کر ایک حساس، باشعور اور سچہ فکر نسل کی حیثیت سے سامنے آئی۔ اور اظہار کے اس نئے وسیلے سے پوری طرح کام لیتے ہوئے اس نے سستی جذباتیت، نعرہ بازی، میلو ڈراما، اور رومان میں بھیگی ہوئی یاسیت سے بہت بلند ہو کر ایسی شاعری کی جس میں واقعیت پسندی تھی، خود احتسابی تھی، حقائق کا سامنا کرنے اور انہیں قبول کرنے کا حوصلہ تھا، قومی مسائل میں اپنی بے مائیگی اور زیادہ کچھ نہ کر سکنے کا افسوس تھا۔ ۱۹۵۵ء کے بعد دس پندرہ برس کی اس نئی عربی شاعری میں فنی خوب صورتی اور توانائی کے ساتھ ساتھ بیان واقعہ کی وہ صداقت بھی پائی جاتی ہے جو عربوں کی قومی زندگی کے کسی دوسرے پلیٹ فارم سے شاذ و نادر ہی سنائی دے گی۔ جون ۱۹۶۷ء میں عربوں کو اسرائیل کے مقابلے میں جو شکست اٹھانی پڑی وہ بڑی حوصلہ شکن تھی۔ جون کو عربی تقویم میں حزیران کہتے ہیں۔ چنانچہ اس شکست کے بعد شاعروں نے حزیران کو اپنی نکتہ دہنریت کی علامت بنایا اور اس کے حوالے سے بہت کچھ کہا۔ اور اس طرح کا اعتراف اپنے بارے میں ایک شاعر ہی کر سکتا تھا کہ :

ہم نژاد زبیاں ہیں افریادیہ اور رائیگاں موت کی نسل ہیں
مشرقی قہوہ خانوں کی سلین میں ہم اپنی بے کار بجٹوں کے ہاتھوں مرے
اے جون کے آفتاب گراں !

تو نے کیوں ہم کو دنیا کی ہر آنکھ پر یوں برہنہ کیا
کیوں سگانِ گرسنہ کی خاطر ہمیں بے کفن سرد لاشوں میں چھوڑا گیا
ہمارا وطن ایک مصلوب ہے اور چاروں طرف
آبرو کی بکھرتی ہوئی راکھ ہے !

شاعروں کی اس بڑی عمر کی، پختہ کار اور نا تجربہ نسل کے نمائندوں میں عبدالوہاب

البیاتی (عراق)، نزار قبانی (شام)، نازک الملائکہ (عراق) اور فدوی طوقان (فلسطین) کے نام بہت نمایاں ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنے عہد کا آغاز داخلیت، وحدانیت اور لذتیت سے کیا تھا، لیکن آگے چل کر وہ واقعیت اور مقصدیت کے ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ہر ایک شاعر کے کئی کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان کی شاعری کے مختلف اثرات اور مؤثران کے کلام کے ان مجموعوں میں باسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے بعد جو ان تر شعرا کی ایک نسل آتی ہے جن میں فن کے اعتبار سے سب سے ممتاز اور پیش پیش محمود درویش اور یحیٰ القاسم ہیں۔ یہ دونوں فلسطین کے اس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اب اسرائیل کے قبضے میں ہے چنانچہ انہوں نے اسرائیل میں رہ کر بہت مشقت، اذیت اور پابندی کی زندگی گزاری ہے، اور روز و شب کے ان تجربوں سے ہی اپنا شعری اسلوب پیدا کیا ہے، اور ایسی صورت حال میں جب کہ شاعر کو کھل کر اظہار کرنے کی آزادی نہ ہو، اور سر پر ہر وقت احتساب اور سنسر کی تلوار لٹک رہی ہو، شاعر کے لیے علامتی اور مبہم انداز بیان اختیار کرنا صرف اس کے فنی مزاج کا تقاضا ہی نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بھی بن جاتا ہے۔ یہ بات ہمیں محمود درویش کی شاعری میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ محمود درویش نے علامتوں کے استعمال سے اپنی شاعری کو جو وسعت اور گہرائی دی ہے اس میں آج اس کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ اور یہاں شاید اس امر کا ذکر نامناسب نہ ہو کہ محمود درویش شاعری میں افرو ایشیائی ادبی تنظیم کی طرف سے لوٹس Lotus انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔

زیر نظر مجموعے میں مذکورہ بالا صرف چھ شعراء کا کلام شامل ہے یہ سب کے سب

۴: ان میں سے صرف نزار قبانی کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور اس کے بعض مجموعوں کے پانچ پانچ اور چھ چھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ عبدالوہاب البیانی کے مجموعوں کی تعداد گیارہ ہے، اور محمود درویش کی سات !

اس وقت کی عربی شاعری کے افق کے درخشاں ترین ستارے ہیں۔ لیکن تقریباً اتنی ہی تعداد اتنے ہی اہم شعرا کی ایسی ہے جن کی نمائندگی اس مجموعے میں نہیں ہو سکی۔ ایسے لوگوں میں خصوصیت کے ساتھ بدرشا کرالیاب (عراق) سلیمان الیمسی (شام) صلاح عبدالصبور (مصر) خلیل حاوی (لبنان) احمد عبدالمعطی حجازی (مصر) اور معین بسمو (فلسطین) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مجموعے کا انتخاب کسی باضابطہ طریقے یا سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے تحت نہیں ہوا۔ ایک باضابطہ انتخاب کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان تمام شعرا کے مجموعے یا ان کا بیش تر کلام ہمارے سامنے ہوتا (بہت دور کا امکان! اس لیے کہ پاکستان میں عربی ادب کی کتابیں ابھی تک جنسِ نایاب ہیں) اور اس میں سے ہر شاعر کی اہم ترین اور نمائندہ نظمیں منتخب کی جاتیں۔ اس کے برخلاف زیرِ نظر انتخاب کا ماخذ صرف ایک ادبی ماہنامہ — بیروت کا ”الآداب“ — ہے جو میرے پاس گزشتہ آٹھ دس برس سے آرہا ہے، اور اسی میں سے اپنی پسند کے مطابق یہ چند نظمیں لی گئیں ہیں۔ اب ”الآداب“ میں ضروری نہیں کہ سبھی بڑے شاعر چھپتے ہوں، اور جن شعرا کا کلام اس میں چھپتا ہے وہ بھی ضروری نہیں کہ اُن کے فن کا بہترین نمونہ ہو — چنانچہ اس اعتبار سے زیرِ نظر انتخاب کو آج کی عربی شاعری کی پوری نمائندگی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج کی شاعری کا جو لحسن اور اول الذکر چھ شعرا کے کلام میں ملتا ہے، وہ اس اعتبار سے ضرور نمائندہ ہے کہ اس کی بدولت ہم فلسطین کی صورتحال کے ضمن میں عراق، شام اور فلسطین کے چند بہترین شعراء کی حساسیت Sensibility اور طرزِ فکر و ادراک سے ایک بڑی حد تک آگاہی حاصل کرتے ہیں، اور ان نظموں کے مصرعوں میں ہم آج کے عرب شاعر کے دل کی دھڑکنیں واضح طور پر سن سکتے ہیں۔

عربی شاعری کے ان ترجموں کا سلسلہ کیوں کر شروع ہوا؟ اس کی بابت مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہ ہے کہ بیروت کے ”الآداب“ میں جب میں نے اس مجموعے کی پہلی نظم، عبدالوہاب

بیانی کی "بکاراتی شمس حزیان" (آفتابِ جون کی نذر۔ ایک نوحہ) پڑھی تو اس نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا، اور میں نے اس کا اردو نثر میں ترجمہ کر کے امجد اسلام امجد کو دیا، جس نے اس بارے میں غالباً مجھ سے کوئی تقاضا بھی کر رکھا تھا۔ بیانی کے اس نوحے نے شاعر امجد کے دل کے تاریکی ہلائے، اور اس نے اسے ایک دو روز کے اندر ہی اردو نظم میں ڈھال لیا۔ ایک ایسی نظم جس کا لب و لہجہ اور مزاج Mood یہاں کی عام نظموں سے بالکل مختلف، اور اس لیے اپنے اندر ایک نیا پن اور تازگی لیے ہوئے تھا۔ میں نے امجد کی اس نظم کو ایک تنقیدی نظر سے دیکھا، یہ جاننے کے لیے کہ ترجمے کے عمل سے گزر کر بیانی کی حساسیت نے کتنا کچھ کھویا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی کہ اردو میں اگر بھی بیانی بیانی ہی رہا اور جو بات اس نے لکائنہ میں کہنی چاہی تھی وہ نوحے میں بھی اسی شدت، اُسی گہرائی، اُسی حسرت اور درد کے ساتھ موجود تھی۔ یہ اردو نظم روزنامہ "امروز" میں شائع ہوئی اور شعراء اور قارئین نے اسے پسند کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ایک دھیمی رفتار کے ساتھ چلتا رہا۔ مجھے جب کبھی اور فرصت ملتی تھی ایک عربی نظم کا نثر میں ترجمہ کر کے لے آتا اور امجد کے حوالے کر دیتا، اور وہ یا چار روز بعد جب امجد سے ملاقات ہوتی تو اس کے پاس اس کا منظوم ترجمہ منسلک کو موجود ہوتا، اور ہم اسے پڑھ کر اس پر تبادلہ خیال کرتے۔ یہ ترجمے بعد میں ماہنامہ "فنون" یا کسی دوسرے اخبار یا رسالے میں چھپ جاتے۔ اس وقت تک ہم میں سے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں تھا کہ آگے چل کر ان منظوم ترجموں کو کتابی صورت میں اکٹھا کیا جائے گا۔ لیکن لاہور میں اسلامی سربراہی کا نفرنس کے انعقاد اور اس کے بعد سے اہل پاکستان نے جس طرح سے مسئلہ فلسطین کے بارے میں زیادہ ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ سوچنا شروع کیا ہے، اس کے پیش نظر یہ مناسب معلوم ہوا کہ عربی نظموں کے ان اردو تراجم کو قارئین کی سہولت اور وسیع تر افادے کے لیے ایک کتابچے میں جمع کر دیا جائے۔

شاعری کے بارے میں یہ کلیتہً اپنی جگہ برحق ہے کہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان کی شاعری

میں نہیں ہو سکتا، اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو شاعر کے پیغام کی وہ تمام باریکیاں، وہ فن کارانہ اشارے اور وہ جادوئی عنصر، جو اصل زبان میں موجود ہوتا ہے، دوسری زبان میں منتقل نہیں ہو پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی زبان میں ایک خاص لفظ اپنے اندر معانی و مفہیم کے جو متعدد پہلو، جو رنگ اور پرچھائیاں اور جو صوتی آہنگ رکھتا ہے، وہ ضروری نہیں کہ دوسری زبان کے اُس لفظ میں بہ تمام و کمال موجود ہوں جو ترجمے میں اس کی جگہ پر لایا گیا ہے، اور جب ایسا ہو تو ترجمے میں مصراعے کی آب وہ نہیں رہتی جو اصل میں ہوتی ہے۔ اس کا مزاج کچھ اور ہو جاتا ہے، اس کی موسیقی بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی ادب کی تاریخ میں ایک زبان کی شاعری سے دوسری زبان کی شاعری میں عمدہ اور فن کارانہ ترجموں کی تعداد اتنی کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسے ترجمے بہر حال موجود ہیں اور ہم انہیں ہمیشہ سے پڑھتے چلے آ رہے ہیں!۔ اس وقت دنیا کی مختلف زبانوں میں آزاد شاعری کی جو روش چل نکلی ہے اس نے مذکورہ بالا کچھ میں کچھ ڈھیل کی گنجائش پیدا کر دی ہے اور قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے آزاد جو کہ ایک شاعر کے لیے یہ پہلے کی نسبت زیادہ ممکن اور قابل عمل ہو گیا ہے کہ وہ کسی اجنبی زبان کی شاعری کا ترجمہ کرتے وقت اصل کے اتنا قریب رہے جتنا کہ فن کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ امجد اسلام امجد کی یہ کوشش محض یہ کہہ کر رد نہیں کی سکتی کہ ان ترجموں میں قاری کو جو آواز سنائی دیتی ہے وہ امجد بی کی آواز ہوگی، بیاتی یا نزار قبانی یا یسح القاسم کی آواز نہیں ہو سکتی۔ میں عربی اور اردو دونوں طرف کی نظروں کو سامنے رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ امجد نے اردو نظم میں ہر جگہ اصل شاعر کی جذباتی کیفیت اور مزاج اور احساس اپنے اوپر طاری کیا ہے اور اس میں اپنے مزاج اور طرزِ احاس کو کہیں نقل نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ جذباتی اور احساسی کیفیت دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے، لیکن اس کے اظہار کے لیے الفاظ الفاظ کی پابندی نہیں کرتے۔ کہیں کوئی لفظ یا فقرہ انا مذہب لانا پڑتا ہے، کہیں کوئی لفظ حذف کرنا پڑتا ہے، تاکہ ترجمے میں شاعر کا موڈ اپنی اصل صورت میں

برقرار رہے۔ شاعری کے ایک مترجم کے سامنے جب بھی یہ اختیار Option آئے گا کہ وہ یا تو اصل کے مفہوم و مدعا کا حق ادا کرے اور اس کی خاطر الفاظ اور جملوں میں ضروری رد و بدل روا رکھے اور اصل شاعر کی بات کے ابلاغ کو لفظوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ تو ایک ذہین اور فن کار مترجم ہمیشہ پہلی صورت کو ترجیح دے گا اور اسی کو اختیار کرے گا۔

— یہی میسر دوست امجد اسلام امجد نے اپنے ان منظوم ترجموں میں کیا ہے !!

آخر میں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ امجد کی ان نظموں کی بنیاد ان نثری ترجموں پر ہے جو میں نے ان عربی نظموں کے کر کے اسے دیے تھے۔ اس لیے جہاں تک معنی و مدعا کا تعلق ہے، امجد کی ان نظموں میں اگر کوئی چسبہ غلط یا اصل سے متضاد پائی جائے تو اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہوگی اور میں اس کے لیے جواب دہ ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر اس کتاب کے قارئین میں سے وہ اصحاب، جو عربی زبان سے شغل رکھتے ہوں۔ ان ترجموں میں اس قسم کی فروگزاشتوں کی نشان دہی کریں گے، تاکہ اگر ضروری ہو تو آئندہ ایڈیشن میں ان کا ازالہ کر دیا جائے۔

عکس

- , عباد الوهاب البیاتی
- , نزار قبانی
- , نازک الملائکہ
- , محمود درویش
- , سمیع القاسم
- , فدوی طوقانی

عبدالوهاب البياضي

بكائية الى شمس حزينان

طعنتنا في مفاهي الشرق حرب الكلمات
و السيوف الخشبية
والاكاذيب و فرسان الهواء
نحن لم نقتل بعيرا او قطاة
لم نجرب لعبة الموت و لم للعب مع الفرسان
او نرهن الى الموت جواد
نحن لم نجعل من الجرح دواة
و من الجبر دما فوق حصاة
شغلتنا الترهات
فقتلنا بعضنا بعضاً و ها نحن قتات

في مفاهي الشرق نصطاد الذهب
ترتدى اقنعة الاحياء في مزبلة التاريخ ،
اشباه رجال

لم لعلق جرما في ذيل هر او حمار
 او نقل للاعور الدجال ؛
 لم لذت باذبال الفرار ؟

نحت جيل الموت بالمجان ، جيل الصدقات
 هزمتنا في مقاهي الشرق حرب الكلمات
 و الطواويس التي تختال في ساحات موت الكبرياء
 و مقالات الذبول الادعاء
 آه ، لطح هذه الصفحة ، هذا الخبر الكاذب
 يا سارق قوت الفقراء
 حذاء الامراء
 بدم الصدق ، و مت مثل فقاعات الهواء
 لم نعد نقوى على لعق الاكاذيب و تحبير الهراء
 و اجترار الترهات

نحت جيل الموت بالمجان ، جيل الصدقات
 لم نمت يوما ، و لم نولد ، و لم نعرف عذاب الشهداء
 فلماذا تركونا في العراء
 يا الله ، للطيور الجارحات
 لترتدى اسفال موتانا ، و نبكي في حياء

آه ، لم تترك على عورتنا ، شمس حذيران رداء
و لہاذا ترکونا للکلاب ؟

جیفا دون صلاة

حاملین الوطن المصلوب فی کف ، و فی الاخری التراب
آه ، لاتطرد عن الجرح الذباب
فجراحی قم ایوب ، و آلامی الانتظار
و دم یطلب نار

یا الله الکادحین الفقراء

نحن لم نهزم ، و لكن الطواويس الکبار
هزمواهم وحدهم ، من قبل ان ینفخ ديار بنار !

* * *

آفتابِ جون کی نذر۔ ایک نوحہ

مشرقی قومہ غانوں کی سین میں ہم اپنی بے کار بجشوں کے ہاتھوں مرے
 جھوٹ کے چوٹی بھتیا رنج کے
 ہواؤں کے گھوڑوں پہ لڑتے رہے!
 موت کے شغل سے ہم شناسا نہیں
 ایسے گھوڑے کے مالک ہیں جو آج تک
 دادی موت کی سمت دوڑا نہیں
 شہسواروں کے پہلو میں بھڑا نہیں
 وہ شکاری ہیں جس نے درندے تو کیا
 اک پرندہ بھی ہاتھوں سے مارا نہیں
 ہم نے زخموں سے اپنے قلم کے لیے روشنائی نہ لی
 روشنائی کو ارضِ دہن پر بے
 خون کے سُرخ دریا سے بدلا نہیں
 ہم زیاں کا رتھے، ایک دُوبے سے لڑتے ہوئے کٹ مرے اور بکڑے ہوئے!

مشرقی قومہ خانوں کی سلیں میں بیٹھے ہوئے آج ہم
 مکھیوں کو پکڑنے کی بے کار دھن میں گرفتار ہیں
 اور تاریخ کے سرد جلے میں ہم ایسی پرچائیاں ہیں
 جو مردوں کے بہروپ میں گامزن ہیں
 ہم پریشان ذہنوں کا ایک خواب ہیں
 جس کی تعبیر سے کوئی واقف نہیں

ہم نثارِ زیاں ہیں، فرومایہ اور رایگاں موت کی نسل ہیں
 مشرقی قومہ خانوں کی سلیں میں ہم اپنی بے کار بختوں کے ہاتھوں مرے
 ہم کو ماما ہمارے امیروں نے، جو آبرو کے جنازے میں شامل ہوئے
 اپنے عشقِ کدوں میں چمکتے رہے !
 اور ان کے حلیفوں کی بازی گری نے
 اور ان کی خوشامد پہ پلٹے ہوئے ان سگانِ کمن نے
 جو نفظوں کا سینہ فریب اور دھوکے سے بھرتے رہے
 اے غریبوں کے دشمن، امیروں کے ٹکڑوں پہ پلتے ہوئے
 اب خدا کے لیے — جھوٹ کی داستانِ بند کر
 اب ہماری نگاہیں ترے کذب کی اس فضول اور لمبی کہانی سے اکتا گئی ہیں۔
 ہمارے یہ تیرے نفظوں کی تقسیم ممکن نہیں
 اب برائے خدا ان کو بیچ کے لو رنگ دریا میں دھو !
 بلبے کی طرح جی، مگر جھوٹ سے باز آ

ہم نژادِ زیاں ہیں، فرومایہ اور رائیگاں موت کی نسل ہیں
 ہم نہ مرنے کے لمحے سے گزرے کبھی اور نہ پیدا ہوئے
 اور نہ ہم کو پتا ہے شہیدوں کی بے نام تکلیف کا
 ہم گدھوں اور چیلوں کی خوراک ہیں — اے خدا!
 ہم کو کیوں اس طرح دشتِ بے آب میں لاکے مارا گیا
 کیوں ہمارے لیے شہم لکھی گئی؟

کیوں ہمیں مرنے والوں کی لاشوں میں زندہ بدن مے کے رکھا گیا؟
 آہ اے جون کے آفتابِ گراں!

تو نے کیوں ہم کو دنیا کی ہر آنکھ پر یوں برہنہ کیا
 کیوں سگانِ گرُسُنہ کی خاطر ہمیں بے کفن، سرد لاشوں میں چھوڑا گیا
 ہمارا وطن ایک معسوب ہے اور چاروں طرف آبرو کی بکھرتی ہوئی راکھ ہے۔
 میرے ہر زخم پر مکھیاں جھنجھناتی ہیں، ان کو عزیزو! اڑاؤ نہیں
 جس قدر زخم ہیں چشمِ ایوب ہیں
 دوستو! ان پر مرہم لگاؤ نہیں

اب مرادکھ فقط انتظارِ مسلسل کا آشوب ہے
 اس کو جھیلوں گا میں

اس کو جھیلوں گا میں اُس چمک دار ساعت کے آنے تک جب لو اپنے بدلے
 کی خاطر اٹھے

اے خدا! — اے غریبوں کے، محنت کشوں کے خدا!

ہاں ہمارا الموجنگ ہمارا نہیں

ہم کو مارا ہے ان رہنماؤں نے جو اپنے عشرت کدوں میں چپکتے رہے
ان سنہری پروں والے موزوں نے جو قوم کے واسطے نقشِ عبرت بنے
ہم کو مارا۔۔۔ بے ان بے ہمنیروں نے جو اکبر کے جنازے میں شامل ہوئے۔

عبدالوهاب الببائي

مرثية الى المدينة التي لم تولد

تطنّ بالناس وبالذهب
ولدت فيها وتعلّمت على اسوارها
الغربة والتجواب
والحب و الموت و منى الفقر
في عالمها السفلى والابواب
علّمتني فيها ابي قراءة الانهار
والنار والسحاب والسراب
و الرفض و الاصرار
علّمتني : الابحار
و الحزن و الطواي
حول بيوت اولياء الله
بحناً عن النور و عن دى ربيع
لم يحنى بعد
و ما زال يطن الارض و الاصداء
منتظرا لبوءة العراى

علّمني فيها انتظار الليل و النهار
و البحث في خريطة العالم عن مدينة
مسحورة دفينّة

تشبهها في لون عينيها و في
ضحكتها الحزينة

لكنها لا ترتدى الاسال
و خرق المهرج الجوال
ولا يظن صيفها بالناس و الذباب

* * *

ایک شہرِ ناپید کا مرثیہ

سکھتے تھے اور لوگوں کی کثرت سے آٹھوں پہر گو بختا یہ مرا شہر ہے
 میری آنکھیں اسی کی ہوا میں کھلیں
 اور اس کی ضعیلوں پہ پھرتے ہوئے
 میں نے آنکھوں سے ادھبل

مناظر کو سوچا

جنہیں دیکھنے کے لیے زندگی بھر سفر کا جہنم سہا
 یہیں میں نے سیکھے محبت کے معنی

یہیں پر نفس کے پس و پیش کا فرق جانا

یہیں میں نے دیکھا کہ کیسے گھروں سے بچھڑنے کا غم

آدمی کو زمیں کی تہوں میں چھپے عالموں کی طرح روتا ہے

اسی شہر میں مجھ کو والد نے چیزوں کی پہچان دی

اور دکھائے مجھے

دشت میں رقص کرتے سراپوں کے جگر

پکتی ہوئی آگ، دریا، اُمنڈتی گھٹاؤں کے لشکر

نفی اور اثبات کا فرق ، نیلے سمندر کے بے انت منظر ،
یہ بتایا مجھے

کس طرح صبر کرتے ہیں ، کیسے بزرگوں کی پاکیزہ روجوں سے ملتا ہے فیضان
اس روشنی کا

ہماروں کی نکھری ہوئی تازگی کا
جواب تک نگاہوں میں اتری نہیں
آستینِ زمیں میں یا بطنِ صدف میں کہیں دفن ہے
اُس مسما صفت کے لیے منتظر
جواے کھونج کر

دہر کی تیرگی کو نویدِ مسرت سے روشن کرے گا
مرے باپ نے مجھ کو دن رات کے انتظارِ مسلسل سے واقف کیا
اور دنیا کے نقشے پہ اس شہر کو ڈھونڈنے کی لگن
دل کو دی

وہ طلسمات کا شہرِ ناپید جو
ہو ہو

میرے اس شہر کا عکس ہے
اس کی آنکھوں کا رنگ اور پھپکی جیسی بھی اسی شہر سی ہے
مگر اس کے تن پر جو بے ہنر دخیلوں کا ٹھکانا نہیں
جذباتِ ان چمکتے اپوششِ آوارہ گردوں کی وحشت سرا ہے
نہ گرمی کے موسم میں دوستی ہوئی مکھٹوں اور لوگوں کی کثرت سے
آنکھوں پر گونجتا ہے۔

نزار قبّاني

حوار مع اعرابي أضاع فرسه

لو كانت تسمعي الصحراء
 لطلبت اليها ان تتوقف عن تفرّج ملايين الشعراء
 و تحسّر هذا الشعب الطيب من سيف الكلمات
 مازلنا منذ القرن السابع نتمضغ الياف الكلمات
 نتزحلق في قشر الرءاءات
 نتدحرج من اعلى الهاءات
 و ننام على هجو جرب
 و نفيق على شكوى الخنساء
 يا بلدي ، كيف تموت الخيل ... ولا يبقى الا الشعراء ؟

مازلنا منذ القرن السابع خارج خارطة الاشياء
 نترقب عنقرة العبسي ... يجيئني على فرس بيضاء
 ليفرج عنا كرهتنا ...
 و يرد طوابير الاعداء

مازلنا نقضم كالفترات ... مواعظ سادتنا الفقهاء ...
 نقرأ "معروف الاسكافي" و نقرأ "اخبار الندماء"
 و نكات جحا ... و "رجوع الشيخ" ... وقصة "داحس والغبراء:
 يا بلدى الطيب ... يا بلدى ...
 الكلمة كانت عصفوراً ...
 و جعلنا منها سوق بغاء ...

لو كانت نجد تسمعى
 والربع الخالى بسمعى
 لختمت انا بالشمع الاحمر سوق عكاظ
 و شنت جميع التجاربن ، و كل بياطرة الالفاظ
 مازلنا منذ ولادتنا
 تسحقنا عجلات الالفاظ
 لو أعطى السلطة فى وطنى
 لقطعت اصابع من صبغوا بالكلمة اهذية الخلفاء ...
 و جلدت جميع المتفعين بدينار ... او صحن حساء
 و جلدت الهمزة فى لغتى
 و جلدت الباء ...
 و ذبحت "السين" ... و "سوى" ... "تاءالتائث" البلهاء
 و الزخرف و الخط الكوفى و كل الاعيب البلغاء

و كنست غبار فصاحتنا
و قتلت قصائدنا العصاء
يا بلدى ... كيف تموت الخيل ولا يبقى الا الشعراء

لو اعطى السلطة فى وطنى
أعدمت جميع المنبطحين على ابواب مقاهينا
و قصصت لسان مغنينا
و فقت عيون القمر الضاحك من احزان ليالينا
و كسرت زجاجته الخضراء
و أرحتك يا ليل بلادى
من هذا الوحش الآكل من لحم البسطاء

يا بلدى الطيب ... يا بلدى
لو تنشف آبار البترول ... و يبقى الماء
لو يغشى كل المنحرفين ، و كل ماسرة الاثداء
لو تطفى اجهزة التكييف من الغرف الحمراء
و تصير يواقيت التيجان نعالا فى قدم الفقراء
لو اعطى السلطة فى وطنى
جسدت قياصرة الصحراء من الاثواب الحضرية
و نزعتم جميع خواتمهم

و محوت طلاء اظافرهم
 و سحقت الاحذية اللباعة ، و الساعات الذهبية
 و أعدت حليب النوق لهم
 و أعدت سروج الخيل لهم ...
 و أعدت النخوة ... و الاسماء العربية !

لو يكتب في يافا الليمون لارسل آلاى القبلات
 لو ان بحيرة طبريا
 تعطينا بعض رسائلها ...
 لاحترق القارى' و الصفحات
 لو ان القدس لها شفة ...
 لاختنقت في قمها الصلوات
 لو ان ... و ما تجدى لو أن ... و نحن نساقر في العاساة
 و نمد الى الارض المحتلة حبلاً شعري الكلمات
 و نمد ليافا منديلا ... طرز بالدمع و بالدعوات ...

يا بلدى الطيب ... يا بلدى ...
 ذبحتك سكاكين الكلمات !

ایک بدو سے گفتگو جس کا گھوڑا کھو گیا ہے

اگر یہ صحرا مری نے تو اسے بتاؤں
یہ شاعروں کا گردہ فصلِ زوال ہے، تو اُسے مٹا دے یا اس کے مزے سے وہ لفظ لے لے
جو کتنی صدیوں سے زہرِ صورت ہماری نسلوں کو کھا رہے ہیں
یہ بانجھ لفظوں کی دگدگی جو ہمارے کانوں میں بج رہی ہے خوش کر دے
یہ لفظ بازی کا شوق جسموں میں کوڑھ کی مثل پھیلتا ہے!
ورودِ شب ہو تو لفظ آنکھوں میں میند بنتے ہیں
پُرچھے تو حروفِ ابجد کا خواب سایہ پکارتا ہے!
مرے وطن یہ عجیب قصہ ہے
مردِ میداں تو کھیت رہتے ہیں اور شاعر
زمین کے سینے پہ حسبِ سابق رواں دواں ہیں

یہ لفظ بازی ہے جس کے باعث ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے زمین کے نقشے پر ہم
مقاموں سے مادرا ہیں۔

ہماری آنکھوں میں آنے والے سراب لمحوں کے خواب سمجھتے ہیں اور کمانوں میں اس

کے گھوڑے کی ماپ بھتی ہے جو ہمارے دلوں کو غم سے نجات دے گا، جو دشمنوں کی صفیں
اُٹ کر شکست دے گا۔

ہم عالموں کے نصائح سنتے ہیں اور فقیہوں کی نکتہ سنجی پہ جھومتے ہیں
ہماری آنکھوں کو داستانوں کی وادیوں میں سکون ملتا ہے، داستانیں جو بانجھ لفظوں کی
بے حقیقت جوانیاں ہیں

مرے وطن اے زمین میری!

فناں! کہ ہم نے وہ لفظ جنسِ دکانِ اہلِ ہوس بنایا

جو قاصدانِ بہار جیسا سبک نوا تھا

حرم کے طائرِ ساخوش نما تھا

اگر یہ محلے نجد میری فناں سے تو اسے بتاؤں

مرے قہر میں ہو تو لفظوں کے کارخانوں کو سُرخ مُردوں سے بند کر دوں! حرفِ ابجد کے
شہسواروں کو قتل کر دوں، کہ یہ ہم کو لفظوں کی چکیوں میں پھل رہے ہیں

گرا میں اپنے وطن میں کوئی مقام رکھتا

تو ایسے لوگوں کی انگلیوں کو تراش دیتا

جو اپنے لفظوں کو ظالموں کے غلیظ جوتوں پر پھیرتے ہیں

اور ان میں ایسی چمک دکھاتے ہیں، جو بھی دیکھے خود اپنے چہرے سے دوبہ دو ہو

تونگروں کے مصائبوں کو ذیل کرتا

جو شور بے کی مک پہ کتوں کی مثل ہونٹوں کو چاٹتے ہیں

اور ان کو لفظوں کے سخت دُروں کی مار دیتا

جو اہلِ زر کی مدح سرائی میں جھوٹ کی فصل کاٹتے ہیں

میں ایسے لفظوں کو کاٹ دیتا جو بے ہنر ہیں
 اور آنے والے دنوں کی جھوٹی تسلیوں سے ہر ایک منظر کو دیکھتے ہیں
 میں لفظ بازوں کے سارے کھیلوں کو، ہشعلوں کو، فصاحتوں اور صنعتوں کو
 وطن کی حد سے نکال دیتا، اور اُن قصیدوں کو پھاڑ دیتا
 جو لگے دفتوں کے خواب دے کر گزرتے لمحوں کو روندتے ہیں
 مرے وطن یہ عجیب قصہ ہے
 مرد میدان تو کھیت رہتے ہیں اور شاعر
 زمیں کے سینے پہ حسبِ سابق رواں دواں ہیں

اگر مجھے دسترس ہو کوئی

تو قہر خانوں کی سیڑھیوں میں پڑے ہوئے ان زیاں پرستوں کو قتل کر دوں جو کشتِ افسوس
 بوری ہے ہیں

تراش ڈالوں زبان ان کی جو اپنے نفوں سے داغِ ذلت کو دھو رہے ہیں
 تباہ کر دوں فلک پہ ہنستے ہوئے قمر کو جو ہم پہ مٹی اڑا رہا ہے!
 وطن میں تیری اُداس شب کو نجات دے دوں اس آئینے سے جو تیری ذلت کی داستانیں
 سنا رہا ہے۔

مرے وطن اے زمین میری

مری دعا ہے کہ سوکھ جائے ترے کنوؤں کی یہ بہتی دولت سوائے پانی کے سب فنا ہو
 جو تیری چاہت سے منحرف ہیں — انھیں سزا ہو۔
 جو بیٹیوں کو سجا کے گاہک کو ڈھونڈتے ہیں، انہیں ہوس کا عذاب پہنچے

وہ اپنے جسموں میں کڑھ چکی ہیں پر موت ان کی طرف نہ آئے !

میں چاہتا ہوں

تو نگروں کے محل — محلوں کے سُرخ کمرے

جدید سائنس کے معجزوں کے کمال، کلچرل کی خوش نمائی

سفید آقاؤں کی وراثت، جلا وطن ہو

حسین تاجوں میں جگمگاتے ہوئے جواہر

غریب لوگوں کی جوتیوں میں مقام پائیں

اگر وطن میں مجھے کوئی اختیار ہو تو میں اپنے صحرا

میں پلٹنے والے نئے امیروں کے بھاری خلعت اتار پھینکوں

یہ ارضِ یورپ کے سارے تحفے جو جگمگاتے ہیں مسخ کردوں

اور ان کے چہروں کو اُس ملمع سے پاک کر دوں جسے سب جاکر یہ اپنے اہل وطن سے ظاہر

میں مختلف ہیں

اضعیس جھاؤں بغیر زینوں کی گھوڑیوں پر

سُلاؤں صحرا کی سرد راتوں میں جب سردی پہ کھلا فلک ہو

جلاؤں ان کو وہ دودھ جس سے نظر میں ان کی وہی چمک ہو جو ان کے ناموں کا حاشیہ ہے۔

عرب شجاعت کا اور غیرت کا نام جس سے تمام تاریخ آشنا ہے

اگر یہ ہوتا کہ پیسٹ یا فاکے اپنی شاخیں قلم بناتے تو ہم کو لاکھوں سلام دیتے

جو طبریا کا اُداس پانی ہیں جدائی کا حال لکھتا

تو کاغذوں میں وہ آگ لگتی کہ پڑھنے والے کباب ہوتے

اگر دہانِ قدس میں کوئی زبان ہوتی تو اس کے ہونٹوں پہ آرزوں کے لفظ ہوتے

مگر یہ سب کچھ اگر کے معرلے بے جہت کا غبار ہے کہ ہم ایک ایسے کی ڈگر پر
دعاں دواں ہیں

حروفِ ابجد کو ہم نے اپنا نشان کیا ہے

ہم اپنی کھوئی ہوئی زمین پر کندِ افسوس پھینکتے ہیں جو شاعری سے بٹی گئی ہے !

ہمارے دامن پہ آنسوؤں کے اور آرزوؤں کے بیل بوٹے ہیں اور ہم نے اسی کو یا فا کی رہ
گزاروں میں داکیا ہے۔

مرے وطن اے زمین میری !

فغاں کہ تجھ کو فضول لفظوں کی گند بھریوں نے کاٹ ڈالا

لما زلزال الملائكة

الضيف

طرق الباب و كنا في ذهول سادرت
 جولا جثله الصمت العزيب
 و على آفاقنا يحثم ليل لا بين
 طرق الباب فقلنا : زائر جاء إلينا
 علته يلقي من الغيب علينا
 بعض وعد عن ديار سرقت منذ سنين
 علته بطقى ليران الحنين
 و فتحنا الباب ملهوفى المآقى صائحين :
 "ضيفنا ! من انت ؟" قال "الفرح"
 جئت جذلان معى ضوء و لحن مرح
 فصفتنا الباب ، أخلينا من العطر يدنا
 و طردنا الضيف عن ابوابنا ، عن مقلتنا
 و على نجوى فلسطين انطوبنا
 ضيفنا العزن الضبابي و دليانا الحنين

و مضينا صامتين

ثم عاد الباب ينطرق
 بيتنا كان كثيباً في بحور الصمت مغرق
 و مآقينا على اهدابها الدمع تألق
 و سمعنا الطرق قمنا مائلين
 من ترى يقلق مأوانا الحزين
 في ضباب الليل و الصمت الضنين ؟
 "ضيفنا من انت ؟ من" قال : "الهوى الحلو المزللق
 جنت في كفى شهد يترقرق -"
 فصفقنا الباب صحناً "لأريد
 نحن حرمنا الهوى ، لن نتذوق
 قبل ان نثار للشعب الشريد
 من مذليته جميعاً و نعيد
 ارضه المسروقة الولهى و مأواه الطعين
 انصرف باضيفنا ان الانين
 و الاسى احنى على الروح و اشفق"
 و صفقنا بابنا و الحزن اهدق
 باغانينا و عدنا نندب الشعب الممزق

ثم هزت بابنا ذات صباح بد ضيف
 طرقت كفاه في عصف و عنف
 لم يكد يمهلنا حتى هزعنا راكضين
 نسبق الخطو اليه هاتفين :
 "ضيفنا من انت ؟" قال "الغضب
 جئت في كفتي كؤوس من لظى تلتهب"
 ففتحنا الباب أنزلناه في ركن مكين
 من دمانا واحتضناه و ثرنا صارخين :
 ان تكن ناراً فتحن العطب
 انفجر يا غيظ و ارتجى بنا يا حقب
 قدتهاوى اسنا المنتعب
 و مضت عنا سنين الصبر و الياس المهيمن
 ضيفنا الحر الجبين
 كل خشن في رواينا سيصفو و يلين
 و سنسرج يافا و جنين
 فالنفجر يا لهب !
 نحن انصارك نحن العرب .. "

مہمان

اُس کی دستک کے سے وقفِ تحیر ہم لوگ
 دشتِ غفلت میں کھڑے دیکھتے تھے
 بے سحر رات کی بے فاصلہ پہنائی کو
 خاک سے تابہ فلک کھلتے چلے جاتے تھے
 شکرِ غم کے علم
 اس کی دستک کی صدا سن کے کوئی کہنے لگا
 آخر کار کوئی آیا ہے
 وہ چمن جس کو غنیموں نے خزاںِ بخت کیا
 اُس کے بارے میں کوئی اچھی خبر لایا ہے
 قاصدِ ارضِ وطن آیا ہے!
 شاید اُس پاس کوئی ایسی خبر ہو جو ہمیں
 غم کے بے نام الاؤ سے رہائی دے دے
 نطقِ خاموش کو پھر نغمہ سرائی دے دے
 ہم نے روتی ہوئی آنکھوں سے اٹھائیں چلیں
 اور اُمید بھرے دل سے کہا

”اے گئی رات کے مہمان! بتا کون ہے تُو بُو؟
اُس نے کہا:

”میں مسرت ہوں، مرے ساتھ ہیں روشن نقمے
انبساط اور خوشی

کھلے پھولوں کی نمک، پھوٹی کلیوں کی ہنسی
اپنے دروازے سے آنکھوں کی گزرگاہیں تک
ہم نے مہمان کو رستہ نہ دیا، عطر کو پھینک دیا
اور کھولے ہوئے دروازے کے پٹ بھیر دیے!

پھر وہی ہم تھے، وہی ارضِ فلسطین تھی، وہی درد کا جال، وہی سرگوشیاں کانوں میں
وہی شامِ ملال

شوق کے کربِ مسلسل میں گرفتار خیال
اُسی خاموش خرابے میں گراں گام تھے ہم

پھر صد اگوں کی کسی دستک کی

اس گھر کی گھر کے درو بام پہ غم لکھا تھا

قصہءِ عہدِ ستم لکھا تھا

ہم اُٹھے اور کہا:

”کون اس خانہ ویراں کا سکون لوٹنے آنکلا ہے؟

دھند میں ڈوبی رات کی سرمد سے ادھر

کون بے فیض نموشی میں چلا آیا ہے؟

دکھ بھری رات کے مہمان، بتا کون ہے تُو بُو؟

اس نے کہا:

”میں گلِ سبز کی خوشبو میں بسی خواہش ہوں
 دیکھ یہ مہکا ہوا شہد مرے ہاتھ میں ہے!
 ہم نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے اور کہا
 ”دکھ بھری رات کے مہمان! ہمیں تنگ نہ کر
 ہاں پلٹ جا کر ہمیں تجھ سے کوئی کام نہیں
 خواہش ہم کو نہیں ہیں جائز
 جب تک قوم کی یہ در بدری باقی ہے
 ہم اغیں پاس نہ آنے دیں گے
 ہم نے دشمن کو ابھی اپنی تباہی کا بدل دینا ہے
 اس کو پیغامِ اجل دیتا ہے
 جب تک ہاری ہوئی قوم کو ہم
 اس کی لٹی ہوئی توقیر نہیں ٹٹاتے
 خواہشیں ہم کو نہیں ہیں جائز
 ”دکھ بھری رات کے مہمان ہمیں تنگ نہ کر
 ہاں پلٹ جا کر ابھی غم کی صدا اور ندامت کی ہوا
 روح کو تجھ سے بھلی لگتی ہے
 ہم نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے
 اور کھوئی ہوئی منزل کے لیے
 دکھ بھرے گیتوں میں پھر قوم کا غم لکھنے لگے۔“

ایک دن صبح سے پھر کوئی دستک گونجی
 اس قدر تیز زکریوں لگتا تھا
 جیسے مہمان کے ہاتھوں میں ہو طوفان کا ہاتھ
 دشتِ غفلت میں چھنکے سے ہوئے
 اور آنکھوں میں چمک سی اُتری
 ہم نے بے تابی سے دروازے طرف جا کے کہا
 "اے نئی صبح کے مہمان! بتا کون ہے تُو؟"
 تیری دستک میں یہ طوفان کا عالم کیوں ہے؟
 اُس نے کہا:
 "میں غضب ہوں"

اشتعال اور تلاطم ہے نشانی میری
 میرے ہاتھوں میں ہیں شعلوں کے چھلکتے پیالے
 ہم نے دروازے کے پٹ کھول دیے
 اپنے مہمان کے قدموں میں جھکے
 اور آنکھوں سے اٹھا کر اس کو، دل کی محبوبتوں میں رکھا
 اور پھر غیظ میں اُٹھ کر چیخے!
 "اے نئی صبح کے مہمان! ہمیں تیرسی قسم!
 تُو اگر آگ ہے، ہم لوگ ہیں ایندھن تیرا
 اے غضب، جوش میں آ
 رات کا عہد ستارے کی طرح ٹوٹ کے گم نام ہوا
 سال ہا سال کی رسوائی بھری خاموشی

اور برداشت کا غم ختم ہوا
 اے چلتی ہوئی بیشیانی کے مالک مہمان!
 دیکھ ان ریت کے ٹیلوں میں بھٹکتی ہوئی اس قوم کا دل
 آگ کا زخیم ہوا

ہو وہ یا فا کر جنین
 اپنی چھوڑی ہوئی مٹی کا ہر ایک ذرہ پاک
 دستِ دشمن سے ہمیں لینا ہے
 انتقام اور غضب کے شعلے! اور بھر دک
 ہم عرب لوگ ہیں انگار ترے
 ہم ترے ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے تیرے
 اور بھر دک
 انتقام اور غضب کے شعلے — اور بھر دک

محمود درويش

- - و يُسدل الستار

عندما ينطفئ* التصفيق

في القاعة ،

و القتل يميل

نحو صدرى - -

يسقط المكياج عن وجه الجليل

و لهذا - - استقيل !

أجد ، الليلة ، نفسى

عارياً

كالمدبحة

كان تمثيلي بعيداً عن مواويل أبى

كان تمثيلي غريباً عن عصافير الجليل

و ذراعى مروحه

و لهذا - - استقيل

لقنوني كل ما يطلبه المخرج
من رقص على ايقاع اكذوبته
و تعبت الآن ،
علقت اساطيري على جبل غسيل
ولهذا .. استقيل !

باسمكم ، اعترف الآن بان المسرحيه
كُتبت للتسلية
رضى النقاد ، لكن عيون المجذليه
حفرت في جسدي
شكل الجليل
ولهذا .. استقيل .

يا دمي !
فرشاتهم ترسم لوحات عن الله ،
و الت العبر ،
ما يالسا سوى جلد طبول
و عظامي كالعصا في قبضة المخرج
لكني اقول :
أتقن الدور غداً ، يا سيدي !

و لهذا - - استقيل !

سيداتي ، آسائي ، سادتي !
سليبتكم عشرين عام
آن لي ان ارحل اليوم
و ان اهرب من هذا الزحام
و اغني في الجليل
للعصافير التي تسكن عش المستحيل
و لهذا - - استقيل -
استقيل
استقيل - -

* * *

پردہ گرتا ہے

جب تالیوں کے شور سے گونجی ہوئی فضا، ہوتی ہے بے صدا
 سایہ سا ایک ہال کے
 سقف و در و دیوار سے
 چلتا ہے اور پھیل کے گرتا ہے، گر بہ پا، دل کا مرے طواف
 ہٹتا ہے الجلیلؑ کے چہرے سے پھر غلاف
 سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

میں خود کو دیکھتا ہوں برہنہ تمام رات
 جیسے ذبیحہ خانہ میں رکھا ہوا بدن
 دیکھے تھے میرے باپ نے ارماں بھرے جو خواب
 میرا یہ کہیں ان کی نہ تعبیر سن سکا
 بخشی تھی الجلیلؑ کی چڑیلوں نے جو نوا

میرا یہ کھیل ان کی نہ تفسیر بن سکا
 ماتھا مرا پسینے میں ڈوبا ہے اور میں
 ہاتھوں سے دھو رہا ہوں ندامت کی گرد کو
 سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

کہتے تھے ”جو پسند ہے ہم کو وہی لکھو
 جس نے رسم لگائی ہے اس کا کہا کرو“
 دھن تھی سفید جھوٹ کی، لیکن وہ ذی وقار
 کہتے تھے ”اس پر رقص کرو، گیت بھی لکھو“
 لیکن میں تھک گیا ہوں، بہت اس کمال سے
 رکھنے لگا ہوں طاق پر فرضی کمانیاں
 سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

والدہ، یقین جانیے، مقصد نہ تھا کوئی
 لکھا تھا میں نے کھیل یہ تفریح کے لیے
 تعریف اس کی ناقدوں نے، اہل فن نے کی
 لیکن مجھے لگا
 اس کی نگاہیں چیر رہی ہیں مرا وجود
 ”اُس نے مرے بدن کی زمین کھرچ کھرچ کر
 ہر ایک ٹوہ پر نقش لکھا“ الجلیل کا
 سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

اے میرے رخوں، مکتے ہوئے بے نشان ہو
 تصویر کش ہیں بغض و عداوت کے وہ قلم
 جن کے لیے سیاہی کا منبع بنا ہے تُو!
 یا فنا ہے جیسے ڈھول پر چمڑا کسا ہوا
 اور اہلِ زرد کے ہاتھ میں میرے یہ استخوان
 چھڑیوں کی ہیں مثال
 ہٹتے ہیں میرے ساتھ، دیتا ہے کوئی نال
 ہر رات ناظرین سے کتنا ہوں جھک کے میں
 کل گر حضور آئیں تو وعدہ ہے یہ مرا
 کردار اپنا آج سے بہتر کروں گا میں
 سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

اُدھے گھروں کے اعلیٰ دارِ فاع اے ناظرین!
 نکاحا ہے میں نے جس برس آپ کے لیے
 زندہ رہا ہوں آپ کی تفریح کے لیے
 لیکن یہ وقت ہے کہ کروں آخری سلام
 سیلابِ رنگ و نور کی موجوں سے بھاگ کر
 گاؤں میں "الجلس" کی گلیوں میں صبح و شام
 گاؤں میں "الجلس" کی چڑیوں کے ردِ برو

۷۱

بھرتی ہیں جو محال اُمیدوں میں رنگ و بو
اڑتی ہیں اپنے خواب کی مستی میں بے مقام
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام
— مرا آخری سلام —

محمود درويش

الدانوبُ ليس أزرق

هي لا تعرفه ،
كان الزمان
واقفاً ، كالنهر ، في جثته
قالت له : جسمي مكان - -

كان ذاك اليوم صيفاً
وكان العاشقان
يستردان من الرزامة الاولى
حساب الشمس
كان الامس
و الحاضر كان - -

هي لا تعرفه
قالوا لها : بأن مع النهر

الذى بأتى من الفجر ،
 و كانت التوأمان
 ضفتى نهر - - بـسيران معاً
 او يقفان
 و هما - - لا يعرفان !
 كان ذاك اليوم حقلاً
 من ذبول و حنان
 و هما يقتربان .
 و يموتان من الموت
 و لا يلتقيان !

هى لا تعرفه
 لكنها تشربه كالباء فى مل الزمان -
 بعد عامين من الهجرة فى الهجرة
 ماتا
 فى انفجار القبلة الاولى
 و فى جثته ، كان الزمان
 واقفا كالنهر فى جثته
 قالت له :
 جسمى مكان !

* * *

ڈینیوب نیلا نہیں سے

نہ تھی وہ اس سے آشنا
 "نماں" اس آدمی کے جسم میں رکھا تھا مثلِ بحرِ بے کراں
 وہ پکاری "اے نماں!
 جسم ہے میرا مکان"

تو گرمیوں کے ایک دن
 وہ دونوں اہلِ عشق اپنے بخت سے تھے ملتے
 ان دنوں کے جن کے چہرے کھو گئے تھے
 جن میں گزرا کل بھی تھا، گریز کرتا آج بھی

نہ تھی وہ اس سے آشنا
 تمام لوگ کہہ رہے تھے صبح دم وہ آئے گا
 مثالِ بحرِ بے کراں۔ رواں دواں
 نہ تھی وہ اس سے آشنا

کہ اس کا اپنا آپ بھی تھا آنے والے کا نشان !
 کہ وہ کناروں کی طرح تھے ہم سفر
 کبھی رُکے ، کبھی رواں
 اگرچہ ساتھ ساتھ تھے مگر تھے دونوں بے خبر

وہ گرمیوں کا دن اک ایسا کھیت تھا
 کہ جس کی خاک میں نہاں تھی مہر و انس کی نمی
 طویل خشک سالی بھی
 وہ ایک دوسرے کی دسترس سے دور تھے مگر
 قریب تھے کہ موت کے سفر میں ہم رکاب تھے
 نہ تھی وہ اس سے آشنا
 مگر وہ جذب کر رہی تھی اس کو اپنے آپ میں
 کہ وہ "زماں" کی ریت تھا تو یہ مثالِ آب تھی
 جسم تھا اس کا "مکان"

وہ بے گھری کی تیرگی میں دو برس کے بعد ہی
 وطن کے آسمان سے دور ہو گئے
 بس ایک دم کی گونج سے
 زماں جو مرد کے بدن میں بھر بے کراں کی مثال تھا رواں
 ٹھٹھ گیا۔

وہ پکاری "اے زماں !
 جسم بے میسہ مکان !"

عمود درويش

قراءة في وجه حبيبتى

و حين اُحَدِّقُ فيكَ
 ارى مُدْنا ضالعة
 ارى زنا قرمزيا
 ارى سبب الموت و الكرياء
 ارى لغة لم تسجل
 و آلهة تترجّل
 اسام المفاجأة الرائعة !
 - - و لتتشرين اسامى
 صفوا من الكائنات التى لاتسمى

و ما وطنى غير هذه العيون التى
 تجعل الارض جسما - -
 و اسهر ليك على خنجر
 واقف في جبين الطفولة :
 هو الموت مفتوح الليلة العذوة القادمة

و انت جميلة
كعصفورة لادمة !
و حين احْدق فيك
و اثوييا
و الطفوله

و اقرأ خارطة الانبياء
و سفر الرضا و الرذيلة
ارى الارض تلعب
فوق رسال السماء
ارى سببا لاختطاف السماء
من البحر ..
و الشرفات البخيلة ..

* * *

چہرہ محبوب کی تحریر

مسوت بچے کی طرح سے ٹکٹی بانڈھے ہوئے
 دیکھتا ہوں جب بھی میں چہرہ ترا
 دیکھتا ہوں ایک شہر بے بشر
 ایک عہدِ قرضی ورہ گزارِ موت و شانِ کبریا۔
 اور وہ بولی کہ جوراچ نہیں
 اور وہ عالی مراتب لوگ جو عرشِ معلیٰ سے اتر کر
 خاک کی اس بے کرائی میں مسافر ہو گئے
 اور پھر تو پھیلتی ہے موبہ نو
 میری نظر کے دُہرو
 صف بہ صف پھیلی ہوئی بے نام دنیا کی طرح۔

یہ زمیں اک جسم ہے اور آنکھ ہے میرا وطن
 بچنے سے میری پیشانی پہ ایک خنجر کا زخم تیز ہے
 اور آج بھی میں

تیری یادوں کے جلو میں جاگتا ہوں
 یوں گماں ہوتا ہے جیسے آنے والی ساری خوشیوں کا مگماں

موت کے پرلی طرف ہے

اور اس جانب ہے تُو

اے شرِ حسن و جمال

آشیاں گم کردہ اور نادم پرندے کی طرح

مکملگی باندھے ہوئے بسوت بچے کی طرح

دیکھتا ہوں جب بھی میں چہرہ ترا

یاد آتا ہے مجھے وہ عرصہ کرب و بلا

اور جیشہ

اور اذیت سے پھر دکتا بچپنا۔

پھر میں غیتوں کے نقوشِ پا کے نقشے

اور اک ایسی مسافت کی کمافی

بڑھتا ہوں جس میں ہزیمت، شاد کامی اور ذلت

ایک دوجے کے جلو میں درج ہیں

یوں گماں ہوتا ہے جیسے یر زمیں

محوِ طرب ہے آسمان کی ریت پر

جی میں آتا ہے کہ جز سے نوچ کر

پھینک دوں میں شام کے اس جھپٹے کو ناگماں

اس سمندر اور اُن اپنے نئے سٹوں سے پرے

جن میں ہیں بے فیض اور محکوم موسمِ حکمراں۔

محمود درويش

امراة جميلة فى سدوم

ياخذ الموت على جسمك شكل المغفرة
و بودى لو اموت
داخل اللذة يا تفاحتى
يا امرأتى المنكسرة
و بودى لو اموت
خارج العالم فى زوبعة مندره !

(للتى عاشقها وجهان :
وجه خارج الكون
و وجه داخل سدوم العتيقة
و انا بينهما
ابحث عن وجه الحقيقة)

صمت عينيك ينادبنى الى مكثين لشوة
و انا فى اول العمر ،

رأيت الصمت .

و الموت الذى يشرب قهوه
و عرفت الداء و الميناء
لكنك ... حلوه !

- - و انا التشر الآن على جسمك ،
كالقمح - - كاسباب بقائى و رحيلى .
و انا اعرف ان الارض امى
و على جسمك تمضى شهوتى بعد قليل
و انا اعرف ان الحب شئ
و الذى يجمعنا ، الليلة ، شئ
و كلانا كافر بالمستحيل
و كلانا يشتهى جسما بعيدا
و كلانا يقتل الآخر خلف النافذة !

(التي يطلبها جسمى - -

جميله

كالتقاء الحلم باليقظة ،
كالشمس التى تمضى الى البحر ،
بزي البرققاله -

و التي يطلبها جسمي ..
جميله

كالتقاء اليوم بالاسم
و كالشمس التي يأتي اليها البحر
من تحت الغلالة

لم نقل شيئا عن الحب
الذي يزدد موتا
لم نقل شيئا ،
و لكننا نموت الآن
موسيقى و صمتا
و لماذا ؟ و كلانا ذابل
كالذكريات الآن ،
لايسأل : من انت ؟
و من ابن التيت ؟
و كلانا كان في حطين
والايام تعتاد على ان تجد الاحياء
موتى ...
ابن ازهارى ؟
اريد الآن ان يمتلي البيت زلابق

این اشعاری ؟
ارید الآن موسیقی المساکین التي تقتل
کی بولد عاشق
و ارید الآن ان انساک
کی یبتعد الموت قليلا
فاحذری الموت الذي
لا يشبه الموت الذي
فاجأ أسى ...

(التي يطلبها جسمي
لها وجهان :
وجه خارج الكون
و وجه داخل سدوم العتيقه
وانا بينها
ابحث عن وجه الحقيقه)

شہرِ سدوم کی حسینہ

تھارے بدن کے خم و پیچ پر مغفرت کی طرح موت وارد ہوئی
 کاش میری بھی اس طور موت ہو!
 تلفذ کے لمحے میں اے میری جاناں،
 مری پڑ سکتے، پری چہرے ر عورت
 کاش میری بھی اس طور، سی موت ہو،
 فنا و بقا کی حدوں سے ادھر
 اک بگولے کے بکھرے ہوئے انت میں

(وہ جو محبوب ہے اس کے دو روپ ہیں
 مادرائے جہاں ایک ہے — دوسرا
 شہرِ سدوم کی گمنگی میں نہاں
 اور مجھ کو انہی دو مددوں کے میاں،
 جستجو ہے حقیقت کے کھوئے ہوئے روپ کی)

تمھاری نگاہوں میں لکھی ہوئی خامشی

مجھ کو مجھ سے اٹھا

بے خودی کی صلیبوں پہ مصلوب کرتی ہے۔۔۔ بچپن مرا

خامشی کے اسی منظر بے اشارہ کی زرینت بنا

میں نے دیکھا اُسے

موت کے روپ میں قہوہ پیٹتے ہوئے،

مجھے روگ کا، اور اس کی دوا کا

ہمیشہ۔۔۔ ہی علم تھا۔ تو مگر....

بہت خوب صورت۔۔۔ ہے اے میری جاں

تمھارے بدن کے خم و پیچ پر میں ہوں پھیلا ہوا

تمہارا بدن !

جو کہ گندم کے دانے کی مثال ہے

نیستی اور ہستی کی تصویر ہے

مجھے علم ہے یہ زمیں میری ماں ہے !

تمھارے بدن پر مری مرنے شہوت نے جو کچھ لکھا ہے، غبارِ فنا ہے !

مجھے علم ہے

کہ محبت الگ چیز ہے اور یہ

اور ہی چیز ہے

جس کے جادو میں ہم

آج کی شبِ قلع کی ڈوری میں الجھے ہوئے

ایک دُوبے کے جسموں۔۔۔ سے بدست ہیں :

ہم میں ہر ایک کو سر پہ لگے حقائق سے انکار ہے
 ہر کسی کو ہوس ہے کسی اور ہی جسم کی
 جو بہت دور ہے! ہاتھ بے نارسا
 ہم میں ہر ایک، اک دوسرے کو
 دریچے کے پیچھے، فنا میں بھی آہٹیں
 جھپٹتا۔ بے صدا۔

(وہ جس کی مرے جسم کو ہے طلب
 خوب صورت ہے یوں
 جس طرح خواب بیداریوں سے ملے
 جیسے سورج سمندر میں نارنجی ملبوس پہنے ہوئے
 یک بیک چل پڑے،
 وہ جس کی مرے جسم کو ہے طلب
 خوب صورت ہے یوں
 جس طرح "آج" گزرے ہوئے "کل" میں پھر سے جیے
 جیسے سورج کی جانب سمندر بہت ہم سے بڑے
 اور تلاطم کا ملبوس تنک چھوڑ دے)

محبت کے بارے میں ہم کچھ نہ بولے
 جو لمحہ بہ لمحہ فنا ہو رہی ہے
 کسی کے بھی بارے میں ہم کچھ نہ بولے

مگر اب کہ ہم آپ ہیں
 غنا اور غموشی کے اس ایک لمحے میں رزقِ فنا
 کیا خبر کس لیے
 ہم میں ہر ایک مغموم ہے، جس طرح
 یادِ ماضی کے گرداب میں یہ کوئی دوسرے سے نہیں پوچھتا
 "کون ہے تُو، کہاں پر ہے تیرا وطن"
 جب کہ حطین میں ہم بھی ایک دُوبے کی پہچان تھے
 زمانے کی گنتی مگر اور بے
 یہ ہمیشہ سے ہی
 مر چکے اور زندوں کے مابین تفریق کرتا نہیں

کھو گیا۔ بے کہاں
 میرا پھولوں سے مسکا ہوا گلستاں؟
 گھر مرا سُو بہ سُو
 پھر چنبیلی کے پھولوں سے ہو مُشک۔ بو۔!
 کہاں چھن گئی ہے مری شاعری؟
 بے مجھے یہ جنوں
 ان کٹاروں کا آہنگ مجھ کو ملے
 کاٹ دے رشتہٴ قلب جن کا ضوں
 اور تخلیق ہو
 آرزو کی تمازت سے دمکا ہوا ایک عاشق کا دل!

اور اب میں تمہیں بھولنا چاہتا ہوں
 کہ سر پر کھڑی موت سے کچھ تو مہلت ملے !
 اور اس موت سے تو کبھی دامن بچا
 جو مماثل نہیں اس رُخِ موت سے
 جس کا سوا گت مری بوڑھی ماں نے کیا۔

(وہ جس کی بے جسم کو بے طلب
 اس کے دروِ پ ہیں
 ماہِ رائے جہاں ایک بے ۔ دوسرا
 شہرِ سدوم کی گنگی میں نہاں
 اور مجھ کو انہی دو حدوں کے میاں
 جستجو ہے حقیقت کے کھوئے ہوئے ردِ پ کی)

سميح القاسم

ما تيسر من سورة السلاسل

عَبثاً تقترب الاسلاك موتى

عَبثاً يطبق ليل و جدار

في دمي يصهل مزمار النهار

و على عيني الواني

و في فكتي صوتي !

أقبل من شاطئ الاعراف يا ارواح اهلي

أقبل ليلة عُرسى و اشهدني

رافعاً في غبطة الموت جبيني

و اشهدني ناصع العزف اصلي

لشهد الياسمين ! !

الغنى ساهر . . و العازفون

لن يناموا

فامنعينا نعمة الاصغاء يا روح بلادى
و اقبلى مزموركنا المزهر فى ملح السجون . .

لم تزل رزامة السجن طويلة
و الاغانى لم تزل تسخر من أسرها
لم تزل رزامة السجن طويلة
و انا التزع الاوراقى من آخرها !

عندما يختلط الحابل بالنابل بى
فى غموض الفكرة المفتعلة
افهم البسمة فى وجه ابى
يوم أردوه قتيلا
و ارى الرعب هوى
فى وجوه القتلة !

ما الذى تفعله بوابة السجن الغيبة
بالاشيدى و ازهارى و حبنى
ما الذى تفعله بوابة السجن الغيبة
بالمفاتيح التى تملا جيبى ؟ !
ما الذى يفعله داء المفاصل

في الزلازِل ،
و آلات العذاب
عندما يصبح دلف الوجهِ في طقس التراب
عالما بالسحر و الغبطة حافل !

ما الذي تفعله قضبان سجنى
ما الذي تفعله ،
مادام عمرى
في زمان الحب برهه
مادام حبسى
طرفه ..
و الموت ... لزهة ؟ !

* * *

ہاں چلے حلقہ زنجیر کی بات

نہیں سلاخوں کے بس میں مجھ کو ہلاک کرنا
 فضیلِ زنداں نہ روک پائے گی راہ میری
 فضول ہے یہ شبِ سیاہ کی تباہ کاری
 کہ میرے خون میں چمکتے دن کی نفیریاں ہیں
 نظر میں اپنے ہی رنگ چھائے ہیں
 اور ہونٹوں پر جو صدا ہے وہ حرفِ جاں ہے

گئے ہوؤں کی عزیزِ روح !
 کبھی تو برزخ کی سرحدوں سے نکل کے آؤ
 کبھی تو میرے زفاف کی شب میں مجھ کو دیکھو
 کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے فنا سفر میں
 جبینِ اپنی بند رکھی
 کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے
 سمدہ غم میں جانے والوں کی مغفرت کی دعائیں مانگیں

مغنیوں کی صدائیں راتوں میں گونجتی ہیں
 لرز رہے ہیں تمام سازوں کے تار جیسے
 کبھی نہ سوئیں گے اہل نغمہ
 مرے وطن، اے متاعِ ہستی — کبھی تو سن لے
 کہ ذرہ ذرہ تری سماعت کا منتظر ہے
 قبول کر لے ہمارا نغمہ
 جو پھول بن کر نواحِ زنداں کی شور مچی میں کھل اٹھا ہے

بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
 اور ایک بے باک قہقہہ ہے یہ گیت ان پر
 جو اس کی بندش کے مدعی ہیں
 بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
 میں ان کے آخر کے ظلم صفحوں کو ایک اک کر کے پھاڑتا ہوں

کبھی کبھی جب مری بصیرت شکست کھاتی ہے،
 اور سر جیں، جہت بھلا کو بھٹکنے لگتی ہیں،
 میری آنکھوں میں کوند جاتا ہے اپنے والد کا وہ بستم
 جو موت لمحے میں اس کے چہرے پر منور لگتا تھا
 دکھائی دیتے ہیں قاتلوں کے سیاہ چہرے
 جو خوف و درہشت کے سرد جاے میں کانپنے ہیں

۹۲

بچہ قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے
 کہ ان کے بس میں نہ گیت میرے، نہ پھول میرے، نہ میری چاہت
 مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے !
 کہ دسترس میں نہیں ہیں ان کی
 وہ گنجیاں، جن سے میری جیبیں بھری ہوئی ہیں
 مجھے کسی عارضے کا ڈر ہے، نہ ان فضیلوں
 میں بربریت کے شاہکاروں کا خوف کوئی
 کہ جب بھی چاہوں
 نئی مسرت سے پُر زمینوں کی سُرخ مٹی میں منہ پھپھانا
 بے میرے بس میں

نہیں ہے کچھ بھی سلاخِ زنداں کی دسترس میں
 کہ میری ساری حیات لمحہ ہے۔ ایک لمحہ
 زمانِ چاہت کے لاکھ قرون میں ایک لمحہ
 یہ قید میری، میرے لیے ہے فقط تماشا
 قضا ہے جس طرح کھیل کوئی۔

سميح القاسم

قَطَرَاتُ دَمٍ عَلَى خَرِيطَةِ الْوَطَنِ الْعَرَبِيِّ

بعث :

تشتجر الاجنحة

يوما ،

و تلتقي من اقاصي الزمن

عصفورة فترت من المذبحة

يوما ،

و قالت :

ساعة - - او قرون

تخبر عني جثتي ،

ان يكون

من ريشها الداسي ،

جناح الوطن !

بان :

وطني محتف في

فما حبر يسيل
عند اقدام قتيل ؟ !

وظيفة للموت :

القبور البلىتها ادعى من الف عام
لم تزل في عرف مولاي الخليفة
باب رزق المقرئ الاعمى
و تجار الكلام - -

اقرع الابواب يا موت
ساعطيك وظيفة !!

اعتراف في عز الظهيرة :

انا غرست الشجرة
انا احتقرت الثمرة
انا احتطبت جذعها
انا صنعت العود
انا عزفت اللحن
انا كسرت العود
انا افتقدت الثمرة
انا افتقدت اللحن
انا بكيت الشجرة

الخبية :

وقفت في الدور
لكي اشترى خبزا لاطفالي
و سرت سنين ..
و حين صار الدهر لي ،
قلبوا ما في يدي من عملة
ساخرين :
تبدلت عملتنا يا حزين !

الامانة :

هيه
يا صوتا من البیداء قادم
عبر بثر النفط ،
و الحزن المسالم
و البكائيات
و النوم على معصم اني
تتقن الذل و انشاد الملاحم

هيه
لي عندك سيف
و خيول و نبوة

لا تعذبني "بلا حول و قوة"
لا تعذبني
ذراعى يهست
و العباء غاشم - -

في العواصف :

الموت
يا شعراء جيل الجرح ،
بالمرصاد واقف
الموت
للصوت المكبّل
بين آلاف المعازك
الموت - - قلت
فحاذروا لفظ الاكاديمية الصفراء
و اجتنبوا المتاحف
في معهد الريح ابتدأنا
فلنكتمل - - في العواصف !

اكتشاك :

لم اصدق كل ما قيل
و لكننى التقيت

بالاحباء و بالاعداء
اعواما طويلة
فاعذرني ان بكيت
دافنا وجهي في صدرك
يا امي القتيلة . .

انتظار :

لم أرجى الموت
و لكن ليالى الغاب
طالت ،
و خيل الاخوة الاحباب
ماتت على الدرب
و لم تصهل على الابواب
لم ارجى الموت
انتظاري
يفتح الابواب ! !

* * *

وطن عربی کے نقشے پر خون کے کچھ پھینٹے

نثر ادنو:

ایک دن ان لمو میں نہائے ہوئے بازوؤں میں نئے بال و پر آئیں گے
وقت کے ساتھ سب گھاؤ بھر جائیں گے

ان فضاؤں میں پھر اس پرندے کے نغمے بکھر جائیں گے
جو گرفتِ خزاں سے پرے رہ گیا

اور جاتے ہوئے — سرخ بھولوں کے کانوں میں یہ کہہ گیا:

ایک لمحہ ہو یا اک صدی دوستو!

مجھ کو ٹٹے ہوئے ان پروں کی قسم

اس چمن کی بہاریں میں ٹوٹاؤں گا

فاصلوں کی فصیلیں گراتا ہوا میں ضرور آؤں گا

محرومی:

میں شہیدوں میں ہوں

پھر بھی میری رگوں میں ابھی تک لہو کا ہے دریا رواں
یہ لہو جو وطن کے لیے وقف تھا۔

اب سیاہی کی صورت گناہِ قلم پر ہے نوحہ کنان

موت کے فمے ایک کام:

کتنی صدیوں سے ہم ان مزاروں کی پوجا میں مصروف ہیں
جو بزرگوں کی تقدیس کے نام پر

کچھ کرائے کے مذہب فروشوں کی روزی کا سامان ہیں
بے بھر سائوں اور بے کار لوگوں کی پہچان ہیں

اے ہوائے فنا، ساعتِ شام ہے
ایک دفعہ پھر مرے در پہ دستک توڑے۔ دیکھ تیرے لیے اب مرے پاس بالکل
نیا کام ہے

اعترافِ گناہ:

میں نے جو پیٹہ بویا تھا اس کا اثر
فصل کی فصل جی بھر کے کنایا بھی ہے!

جب وہ بخر ہوا تو اُسے کاٹ کر
اس کی لکڑی سے سازدوں کی تخلیق کی

انہیں پھر سروں سے سبایا بھی ہے!
ایک اک کر کے پھر خد ہی توڑے رباب

اور سُری قتل کیں

اس سے تخلیق کی قوتیں چھین لیں
 میرے تہذیب کے پیڑ پر اب کبھی
 سُرخ پھولوں کے پرچم نہ لہرائیں گے
 آنسوؤں کی زباں پر ہے یہ داستاں
 اب گئے دن پلٹ کر نہیں آئیں گے

نامرادی:

برس ہا برس
 آنے والے دنوں کے چمک دار خوابوں میں کھویا ہوا
 میں قطارِ فنا میں قدم در قدم آگے بڑھتا رہا
 اور جب میں زمانے کی دکان پر
 اپنے گھر کے لیے روشنی مول لینے کی خاطر گیا
 تو مرے حال پر تیسرگی ہنس پڑی
 میرے ہاتھوں میں سکوں کا انبار تھا
 پر دکانِ جہاں کی کرنسی نہ تھی

امانت:

اے صدا!
 دامنِ دشت کے اس کنارے سے آتی ہوئی اے صدا!
 وہ کنارہ جہاں گرم چشموں میں دولت کا سیلاب ہے
 بحرِ تسکینِ غم امن کا خواب ہے

لوگ اپنے گناہوں پہ روتے بھی ہیں
 اور زلفوں کی خوشبو بھری چھاؤں میں روز سوتے بھی ہیں
 داستانِ ہزیمت پہ نادم بھی ہیں !
 رزمِ گیت گانے میں بھی طاق ہیں
 دامنِ دشت کے اُس کنارے سے آتی ہوئی اے صدا !
 تو! میں ہے مری اس دراشت کی جو احسہِ مجتبیٰ کی کفِ خاک ہے
 (اس کے پیغام کا ورثہ پاک ہے)
 اسبِ شعلہ قدم اور طوارِ جو میری قومی شجاعت کے پرچم بھی ہیں
 مجھ کو تقدیر کے جیسے بے نام کی داستانِ مت سنا
 میرا دل مت جلا
 یہ ہزیمت کا دکھ وہ گراں بوجھ ہے جو نہامت کے لفظوں سے اٹھتا نہیں
 میرا بازو مرے جسم سے کٹ گیا — اے صدا !
 دامنِ دشت کے اُس کنارے سے آتی ہوئی اے صدا !

منزلِ سیل :

موت ہی موت ہے
 ہر طرف موت ہے
 اے ہزیمت زدہ نسل کے شاعر !
 شاعری اور نغمہ نگری کے لیے یہ گھڑی موت ہے !
 مکتبوں اور دانش کدوں میں کتابوں کے انبار ہیں
 اُن کی مُردہ ملک اور بوسیدگی سے کنارہ کرو

ان گھٹن سے بھرے تنگ کمر دل سے نکلو
 یہاں کی ہوا میں چھپی موت ہے!
 ہم نے پہلا سبق اپنے صحراؤں کی درس گاہ سے لیا
 آخری مرحلہ مکتبِ سیل ہے۔

پچھتاوا:

لوگ کہتے رہے
 دوستوں، دشمنوں میں چناؤ کرو
 میں نے ان کے کئے پر توجہ نہ کی اور رسوا ہوا
 اے مری مادرِ مہرباں! میری ارضِ وطن!
 میں تیری گود میں سر چھپائے ہوئے آج تیرے کرم کا
 طلب گار ہوں، توجھے بخش دے

انتظار:

موت کا راستہ میں نے جھوڑا نہیں
 منتظر ہوں کہ کب یہ شبِ تارِ صحرا کٹے
 اور اترے مرے شہر میں قافلہ مرگ کا
 قافلہ مرگ کا
 جو ہر زمینیت کے جنگل کی جانب گیا اور لوٹا نہیں

۱۰۵

منتظر ہوں کہ کب میرے ساتھی پہنچیں

اور ہم دیکھ لیں حوصلہ مرگ کا

شوق کا ساتھ ہو تو مرے دوستو!

دو قدم بھی نہیں فاصلہ مرگ کا

فدوى طوقان

جريمة قتل فى يوم ليس كالايام
الى الطالبة الفلسطينية الشهيدة "مستهى"

و يوم امتطى صهوة العالم الصعب يحمل غصناً بيد
و يحمل سيفاً بيد
و يوم الحبيبة فى الاسر هبت عليها الرياح محملة باللقاح
مضت "مستهى"
تعلق اقبار افراحها فى السماء الكبيرة
و تعلن ان المطاف القديم انتهى
و تعلن ان المطاف الجديد ابتدا.

بغرفتها اسمها المتعبة
تلملم اوراقها المدرسية :
(حذار العدى يا بنيتي
فعين العدو تصيب) — و ما كذب القلب — كان
عدو الحياة يطاردها فى المسيرة

و ينشرب في عنقها مخلبة

تفتح مربولها في الصباح

شقائق حمرا و باقات ورد

و عادت الى الكتب المدرسية كل سطور الكفاح — التي حذفوها

و عادت الى الصفحات خريطة اسن التي مزقوها

و رفر "مربولها" راية في صفوف المدارس ،

رفر و امتد ، ظلل في الضفة المشربة

شوارعها المغضبة

و اشجارها المثقلات ، رفر مربولها راية في النوافذ ،

فوق سطوح المنازل ، فوق رفوف الدكاكين ،

ظلل في الضفة المشربة

مساجدها و الكنائس ، ظللها قبة بعد قبة

و ما قتلوا منتهى

و ما صلبوها

و لكنها خرجت منتهى

تعلق اقبار افراسها في السماء الكبيرة

و تعلن ان المطاف القديم انتهى

و تعلن ان المطاف الجديد ابتدا

* * *

ایک انوکھے دن میں وارداتِ قتل

شہیدِ فلسطینی طالبہؒ منتہاؒ کے لیے

جس گھڑی وہ چلا
تو سنِ وقت کی پیٹھ پر بیٹھ کر
تین ایک ہاتھ میں
دوسرے ہاتھ میں لے کے
جس گھڑی اس وطن کے در و بام میں
کچھ زنداں کی حسرت بھری شام میں
وہ ہوائیں چلیں
جن میں شامل تھے امکان کے نامہ بر
اس گھڑی منتہیؒ
اپنی خوشیوں کے چاندوں سے جھولی بھرے
سوئے دشتِ فلکؒ اپنے گھر سے چلی
یہ بتانے کہ اب زندگی کے ہر اک کہنہ انداز کی ہو چکی انتہا

یہ بتانے کہ اب ہو رہی ہے نئے دور کی ابتدا

اس کے کمرے میں اس کی تھکی ماندی ماں
 بے خیالی کی پھیلی ہوئی دھند کے درمیاں
 اس کی درسی کتابوں کے ادراق سے کھیلے کھیلے
 خود کلامی میں تھی،

”میری نورِ نظر
 دشمنوں کی نگاہیں بہت تیز ہیں
 ان سے کرنا حذر“

اس کا یہ دوسرا بے حقیقت نہ تھا
 واقعی اس گھڑی، خنجرِ بد گہر
 اس کی نورِ نظر کے تعاقب میں تھا
 اس کے حلقوم پر تھی عدو کی نظر

صبح دم جس گھڑی
 اس کے لاشے کے چہرے سے چادر ہٹی
 تو گلابوں کی مسکار وحشی ہوئی
 اور چادر تلے سُرُخ بھولوں کے دستے ہویدا ہوئے
 اور درسی کتابوں کے ادراق میں
 جراتِ داغی کے وہ سارے سبق
 جو کہ محذوف تھے، پھر نمایاں ہوئے

بے ہنر اور سادہ ورق کی جیہیں
 ان حدوں کی لکیروں سے روشن ہوئی
 جن کا نقشہ عدد کے سیہ ہاتھ سے
 پارا پارا ہوا
 اس کی چادر سکولوں میں پٹی ہوئی
 نوجوان آرزوؤں کا برہنہ بنی
 جو کھلا اور پھر
 از نظر تا نظر پھیلتا ہی گیا
 ساحلی بستیوں کے فرازوں پہ چھاتا ہوا
 تندہ خواہراہوں پہ، بوجھل درختوں پہ، سایہ بنا
 کھڑکیوں میں، گھروں کی چھتوں پر
 کانوں کے شیشیوں پہ ظاہر ہوا
 ادویوں منتہی دیکھتے دیکھتے
 اونچے ساحل پر بجھری ہوئی بستیوں کے درہام پر
 آسمان کی طرح خیمہ زن ہو گئی

منتہی لاش ہے پر اسے قتل کس نے کیا بہ کب کیا !
 کون ہے جو کہے میں نے مارا اسے
 اسے کون منسوب کرتا کہ جو
 سوئے دشتِ فلک
 گھر سے نقشِ فنا کے رخصت ہوئی

اپنی خوشیوں کے چاندوں سے مھجولی بھرے
یہ بتانے کہ اب زندگی کے ہر اک کُنہ انداز کی
ہو چکی انتہا
یہ بتانے کہ اب جو رہی ہے نئے دور کی ابتدا

اہل پاکستان نے اہل عرب سے ہمیشہ والہانہ اور بے لوث محبت کی ہے۔ اس کا بڑا سبب اسلام کا وہ ہمہ گیر رشتہ ہے جس کے دم سے عرب اور پاکستانی صدیوں سے ذہنی اور روحانی طور پر مربوط ہیں۔ مگر زمانہ حال میں سامراج نے عربوں کے ساتھ جو سفاکانہ بدسلوکی کی ہے اس نے ایشیا اور افریقہ کے حریت پسندوں کی غیرت کو کچھ اس طرح للکارا ہے کہ اب فلسطین کا مسئلہ محض عربوں کا یا محض مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ یہ کمرۂ ارض کے ان سب انسانوں کا مسئلہ ہے جو آزادی سے محبت کرتے ہیں اور قوموں کے حق خود ارادیت کے تحفظ کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج مسئلہ فلسطین کے بارے میں ہر بڑے چھوٹے ملک کا رویہ اس کے اخلاقی اور سیاسی معیاروں کی کسوٹی بن چکا ہے۔

کسی ملک کا ادب وہاں کے باشندوں کی اُمگوں، آرزوؤں، محرومیوں اور شکستوں کا آئینہ ہوتا ہے اور گزشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصے میں عرب اہل قلم نے جس شدت احساس کے ساتھ ادب کے اس منصب کو پورا کیا ہے، وہ دنیا بھر کے مزاحمتی ادب کا ایک روشن باب ہے۔ اہل پاکستان کو آج کے عرب ممالک کی سوچوں سے متعارف کرانے کا ایک بڑا اور مؤثر ذریعہ وہاں کا ادب ہے مگر ہمارے ہاں بہت کم اصحاب ایسے ہیں جو عربی زبان پر عبور بھی رکھتے ہوں اور معاصر عربی شعر و ادب کی روح میں اُتر جانا بھی جانتے ہوں۔ امجد اسلام امجد نے ”عکس“ کے ذریعے، ستید محمد کاظم کے سے ادیب اور عالم کے تعاون سے، اس بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنے کا نہایت خوبصورت آغاز کیا ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ معاصر عربی شاعری کے اس نمائندہ انتخاب کے معیاری اور بھرپور منظوم اردو ترجمے کا ہمہ گیر خیر مقدم کیا جائے گا۔